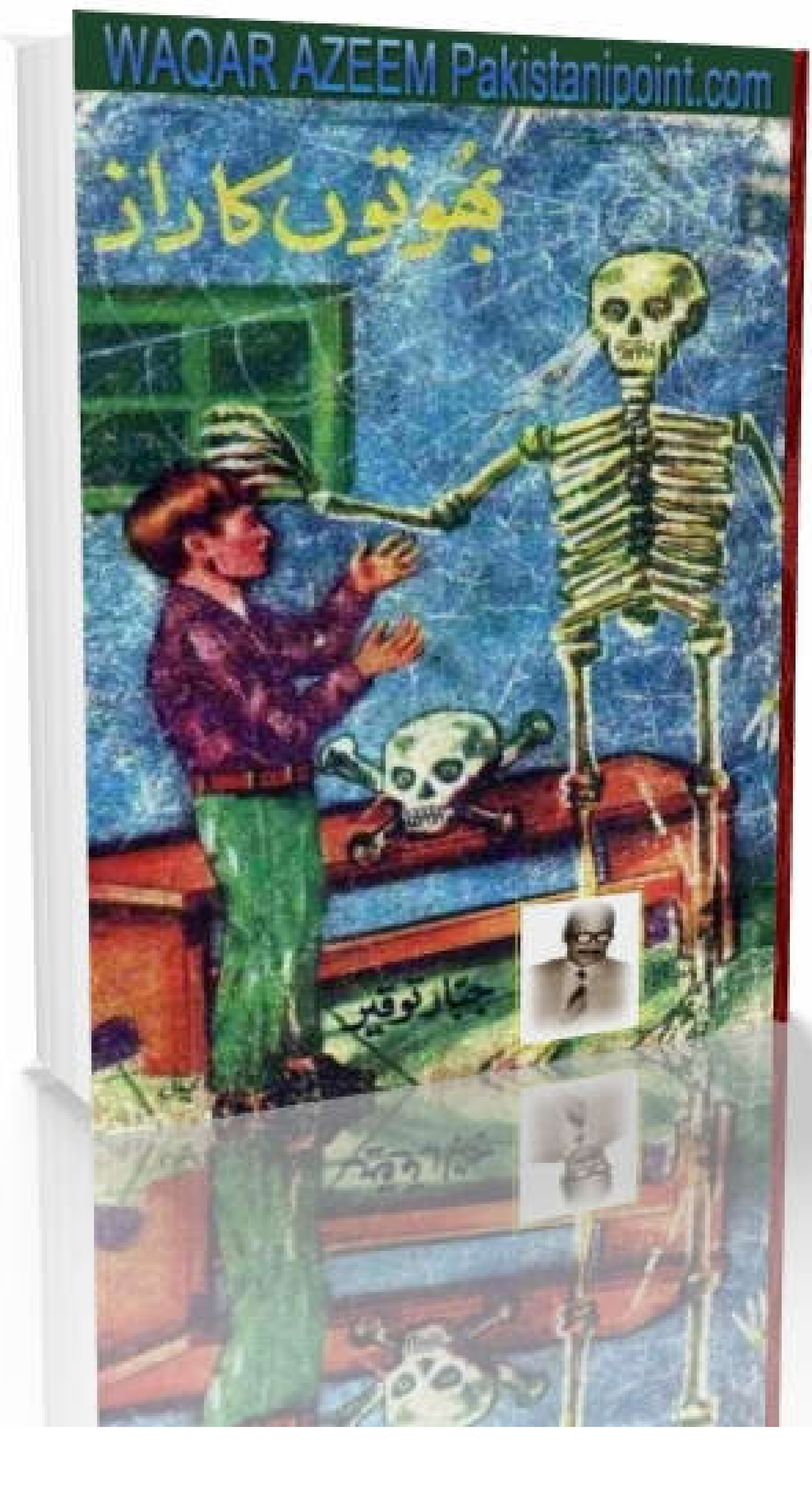
WAQAR AZEEM Pakistanipoint.com
بھوتوں کا راز
جبار توقیر

WAQAR AZEEM Pakistanipoint.com

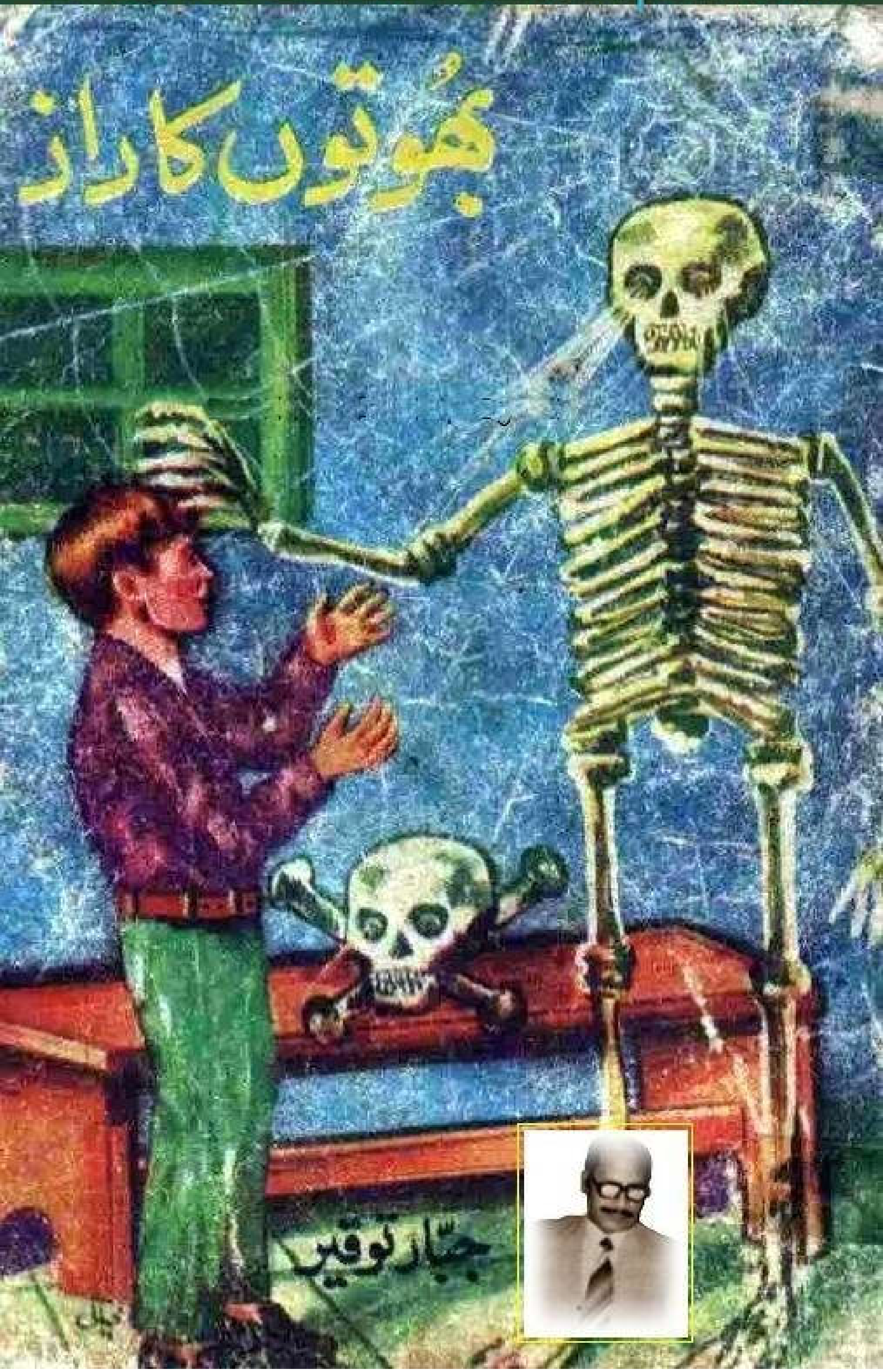

بچوں کے لیے ناول

# بھوتوں کا راز

جبار توقیر

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور ـــــ حیدرآباد ـــــ کراچی

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ

قیمت ——— تین روپے پچاس پیسے

باہتمام شیخ نیاز احمد پرنٹرز
علمی پرنٹنگ پریس ۷ ہسپتال روڈ لاہور میں چھپا
مقام اشاعت:
شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

# باب ۱

نام ہم دونوں بھائیوں کے ایک جیسے ہیں۔ مجھے صابر کہتے ہیں اور بھائی صاحب کو شاکر۔۔ ابا جان نے ہمارے نام قافیہ ردیف کی رعایت سے کچھ ایسے ہم آواز رکھے تھے جن سے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ ہم ایک ہی کمپنی کے بنے ہوئے ہیں۔ ایک ہی چھت کے نیچے پرورش پاتے ہیں۔ ایک ہی نل سے پانی پیتے ہیں اور ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ بھائی صاحب اللہ کے فضل سے شاکر ہیں اور میں صابر۔۔ یعنی ہم دونوں مل جل کر صبر شکر کرتے رہتے ہیں' اور اس صبر شکر کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے پچھلا کچھ عرصہ بڑی تکلیفوں میں گزارا ہے۔ بڑے بڑے خوفناک معرکے سر کیے ہیں اور اُن تمام معرکوں میں میں نے کوئی کم تیر نہیں مارے۔ پھر بھی اُن تمام فتوحات کا سہرا بھائی صاحب اپنے سر باندھتے ہیں اور مجھے وہ کودن سمجھ کر بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں؛ پھر بھی میں بڑے صبر سے وقت گزار رہا ہوں کہ ٹھیک ہے بھائی شاکر صاحب' ایک نہ ایک دن تو آپ کو ضرور ہی محسوس ہو گا کہ صابر بھی کسی ایسی ویسی مُنّے کا نام نہیں ہے جسے آپ مسلسل نظر انداز کر سکیں؛

ہماری ان تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کی ابتدا دراصل طارق روڈ

کے اُس کوارٹر سے ہُوئی جس میں سانس لینا بھی مشکل تھا۔ گرمیوں کی تپتی دوپہریں جب ہمیں اُس ایک کمرے کے کوارٹر میں گزارنا پڑیں تو ہمیں نانی اماں یاد آگئیں۔ یہ محاورے والی نانی تھیں جو ہمیں یاد آتی تھیں! ورنہ اپنی اصل نانی کی تو ہم نے صُورت ہی نہ دیکھی تھی۔ وہ قبر ایسا تنگ کوارٹر تھا جس کا کرایہ ہر ماہ ہم مبلغ پچاس روپے نقد، نصف جن کے پچیس ہوتے ہیں مالک مکان کو بڑے ادب و احترام سے پیش کیا کرتے تھے۔ وُہ ہر مہینے کی دو تاریخ کو صُبح سویرے اپنی چھڑی ٹیکتا ہُوا ہمارے دروازے پر پہنچ جاتا تھا۔ پہلے تو وُہ خُوب زور زور سے لمبے لمبے سانس کھینچ کر ہمیں یہ احساس دلاتا کہ وُہ ابھی مرا نہیں اور خُدا کے فضل وکرم سے ہمارا خُون چُوسنے کے لیے ابھی زندہ ہے۔ خُدا معلوم اُسے کس نے بتا دیا تھا کہ ہم ہر روز اس کی موت کی دُعائیں مانگتے ہیں؛ ورنہ ہم نے کبھی اُس طرف دھیان ہی نہ دیا تھا کہ وُہ مرا ہے یا زندہ ہے۔ وُہ دروازے پر رُک کر بڑے پیار سے اپنی توند پر یُوں ہاتھ پھیرتا جیسے کوئی اپنے پیارے اور لاڈلے بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر رہا ہو۔ پھر جب وُہ ایک لمبی سی گونجدار قسم کی ڈکار لیتا تو یُوں لگتا جیسے کوئی بمبار طیارہ نشانے پر بم پھینک رہا ہو۔ گھُوں گھمک جیسی آواز جب اُس کے گول مٹول بڑے سے ہنڈیا جیسی تربوز اُلٹے مُنہ سے نکلتی تو ہمارا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو جاتا۔ وہ صُبح صُبح دراصل ہاتھ ہاتھ بھر لمبے دو گلاس دہی کی لسی کے چڑھا کر آتا تھا۔

پھر وہ ارنے بھینسے کی طرح ڈکاریں نہ لیتا تو اور کیا کرتا۔ جب اُچھلتی کودتی حیران پریشان تنی اُس کے پیٹ کے گورکھ دھندے میں کہیں ٹھیک سے بیٹھ جاتی تو پھر وُہ ہمارے دروازے پر اپنی بھاری بھرکم چھڑی یُوں ٹھک سے مارتا جیسے وُہ کسی سوئے ہُوئے اُونٹ کو جگا رہا ہو۔

ابّا جان عموماً اس وقت حجامت بنا رہے ہوتے تھے۔ کئی بار ہم نے آزمایا کہ دو تاریخ کو اُدھر ابّا جان نے ڈاڑھی پر صابن لگا کر خُوب خُوب جھاگ پیدا کر لی اور اِدھر دروازے پر گھُول گھُک ڈکاروں کی آواز گونجی اور ہم جل تُو جلال تُو آئی بلا کو ٹال تُو کا ورد کرنے لگے۔ کیوں کہ ہم سمجھ جاتے تھے کہ مالک مکان صاحب "تشریف لے آتے ہیں۔" ہم چھوٹی سی کھڑکی میں جالی کے پیچھے سے اُسے دیکھتے اور جب وُہ بڑے بزرگانہ انداز سے اپنی لمبی چوڑی توند پر ہاتھ پھیرتا تو ہماری ہنسی چھُوٹ جاتی۔ وُہ ہماری آواز سُن کر ایک دم سنبھل جاتا اور پھر بڑے رُعب سے وہ دروازے پر ٹھک سے چھڑی دے مارتا۔

"لو وُہ مُوا پھر آ دھمکا — اے مَیں نے کہا شاکر کے ابّا اُس کا سیاپا کر لو پہلے۔" امّی جان سخت بے زار ہو کر دبی زبان میں کہتیں اور ابّا جان صابن سے لتھڑا ہُوا مُنہ دروازے کے پردے سے باہر نکال کر بڑی مُحبّانہ نظر سے اُسے دیکھتے اور کہتے :

"اچھا اچھا' چوہدری صاحب آئے ہیں۔ ذرا ٹھہریے' مَیں ابھی پیسے لایا۔ اِتنے میں امّی جان پیچھے سے دس دس کے پانچ نئے کڑکڑاتے نوٹ اُنہیں تھما دیتیں اور ابّا جان برُش والا ہاتھ پیچھے ہٹا کر دُوسرے ہاتھ سے وہ نہایت ہی قیمتی نوٹ مالک مکان کو دے دیتے۔ نوٹ دیکھ کر وُہ کھی کھی ہنستا۔ اُس کی مَیلی چکٹ بتیسی باہر نکل آتی اور وُہ کہتا :

" اچھا اچھا 'خیامت" کر رہے تھے آپ۔ کوئی بات نہیں باؤجی' ٹھیک ہے اچھا سلام لیکم" اور یہ کہہ کر وہ چھڑی ٹیکتا ہُوا دُوسرے کوارٹر کی طرف چل دیتا۔

ہمیں اِس کوارٹر میں رہتے ہُوئے ڈیڑھ سال ہو چکا تھا—— سردیاں تو ہم کسی نہ کسی طرح گزار ہی لیتے تھے، مگر گرمیوں میں ہمارا حال اِس کوارٹر میں ایسا بُرا ہوتا تھا کہ خُدا کی پناہ—— اب پھر دُوسرا موسم گرما آنے لگا تھا۔ مئی جُون کی گرمی میں وہ کوارٹر دن رات تنُور کی طرح تپا کرتا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ ہمارے پاس کوئی بجلی کا پنکھا بھی نہیں تھا۔ گرمی دانوں کی وجہ سے ہم سب کا حُلیہ بگڑ چکا تھا اور ہم ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کوارٹر ہسپتال کا وارڈ ہی بن جاتے۔ ہم ایک دم سارے کے سارے بیمار پڑ جائیں اور ایک ہی کمرے میں لمبے لمبے لیٹ کر ایک دُوسرے کو حسرت سے تکا کریں۔ کوئی مانگے پانی اور کوئی مانگے دوا۔ مگر دینے والا کوئی بھی

نہ ہو۔

کوئی بھلا کب تک ایسی مُنہ زور گرمی برداشت کر سکتا ہے۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ بس کسی دن بیمار ہونے کے بجائے بس سیدھا مَر ہی جاؤں۔ چھکے چھکے لیٹے لیٹے موت آئے اور مجھے اُٹھا کر کے "چل بھیا میرے ساتھ تجھے اللہ میاں بُلاتے ہیں" اور میں اُس کے ساتھ چل دوں اور کہوں۔ "یس میڈم میں حاضر ہوں"۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سب اِس کوارٹر سے تنگ آ چکے تھے۔ اس کے کسی بھی کونے میں ہمیں چین نہ مِلتا تھا۔

یہ جون ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ بھارت سے ہماری جنگ ختم ہوئے کافی دن گزر چکے تھے اور ہم نے اُن کے تمام علاقے واپس کر دیے تھے۔ ایک دن شاکر بھائی نے ہمیں بتایا کہ اُس نے ہمارے لیے ایک کوٹھی تلاش کر لی ہے۔ اُس میں بہت سے کمرے ہیں۔ چاروں طرف برآمدہ کھنچا ہوا ہے۔ کوٹھی کے ارد گرد ایک وسیع لان ہے جس میں یہ لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی ہے اور اس کا پھاٹک تو اتنا شاندار ہے کہ آدمی ساری عمر پھاٹک پر ہی گزار سکتا ہے۔

اُس کی یہ باتیں سُن کر امی جان نے پوچھا کہ اُس کا کرایہ کیا ہوگا تو بھائی شاکر صاحب بولے:

"کرایہ؟ ارے امی جان، کرایہ اُس کوٹھی کا صرف تیس روپے ہوگا"

"تیس روپے؟ یعنی پندرہ دُونے تیس روپے کُل؟ ارے بھائی صاحب کہیں آپ خُدا نخواستہ بھنگ وغیرہ تو نہیں پی آئے ہیں؟" مَیں نے شاکر صاحب کو بڑے غور سے دیکھتے ہُوئے کہا۔ وُہ اکثر اوقات ایسی انٹ شنٹ باتیں کیا کرتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ انہیں اسی جُرم میں چھت پر سے جاکر گلی میں دھکا دے دیا جائے تاکہ دوسرے گپ بازوں کو عبرت ہو۔ میری بات سُن کر وہ چمک کر بولے:

"کیا مطلب؟ یعنی تو سمجھتا ہے کہ مَیں جھُوٹ بول رہا ہُوں!"

"بات یہ ہے جناب قبلہ بھائی صاحب مدظلہ علیہ، تیس روپے میں تو میانی صاحب میں کوئی قبر بھی کرایے پر نہیں ملتی ہے آج کل کیوں کہ مُردے بھی سیانے ہو چکے ہیں اور آپ فرماتے ہیں کہ وُہ کوٹھی ہے جس میں بہت سے کمرے ہیں۔ برآمدہ ہے، لان ہے، فلاں ہے، ڈھمکاں ہے، تو مَیں کیسے یقین کر لوں!" مَیں نے نہایت ادب سے گزارش کی۔ اس پر وُہ بولے:

"ہُوں، تو تُو اب بزرگوں کے سامنے بھی زبان چلانے لگا ہے۔ مَیں تجھے اور امی جان کو ابھی لے جا کر وہ کوٹھی دکھاؤں گا۔ پھر تیری آنکھیں کھُلیں گی۔ تُو رات کو آنکھ میں سُرمہ اور کان میں بادام روغن ڈالا کر تاکہ تیری نظر تیز اور تیری سماعت تیز ہو جائے!"

جاننا چاہیے کہ وہ آٹھویں جماعت میں نہایت بُری طرح ناکام ہونے کے بعد اب ادیب فاضل کی تیاری کر رہے تھے۔

چاہتے تھے کہ "وایا بھٹنڈہ" دسویں پاس کر کے اپنی کھوئی ہوئی عزت بحال کر لیں۔ وہ مجھ پر رُعب جمانے کے لیے اکثر موٹے موٹے الفاظ استعمال کرتے تھے۔

"مگر بیٹے، اتنی بڑی کوٹھی وہ تمیں روپے مہینے پر کیوں دے رہے ہیں۔ ضرور کوئی وجہ ہو گی۔" امّی جان نے کہا۔

"وجہ یہ ہے امّی جان کہ کوٹھی کا مالک امریکہ گیا ہوا ہے۔ وہ پانچ سال وہیں رہے گا۔ اُس کوٹھی کے چوکیدار کو لنڈے بازار میں دو سو روپے کی نوکری مل رہی ہے۔ اتنی روپے وہ کوٹھی کے مالک سے لیتا ہے جس نے حکم دے رکھا ہے کہ کوٹھی کسی کو کرایہ پر نہ دی جائے مگر چوکیدار چاہتا ہے کہ ہم اُس کوٹھی میں چلے جائیں تاکہ اس کی دیکھ بھال بھی ہو سکے۔ اُسے مالک سے بھی اتنی روپے ملتے رہیں اور ہم سے تمیں روپے وہ الگ کھرے کرے گا۔ پھر وہ بے فکر ہو کر لنڈے بازار میں دو سَو روپے کی نوکری بھی کر سکے گا۔"

"ایسا نہ ہو کہ مالک مکان اچانک واپس آ جائے اور ہمیں نکال باہر کرے۔" امّی جان نے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے امّی جان، وہ ایسا بے ایمان آدمی نہیں ہے۔ اطلاع دے کر آئے گا اور ہمیں وہاں پا کر خوش ہو گا۔ ہم اُس کی کوٹھی کا ہر طرح خیال رکھیں گے۔"

"تو چلو پھر دکھاؤ ہمیں وہ جگہ۔" امّی نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد بھائی شاکر صاحب ہمیں تانگے میں بٹھا کر ماڈل ٹاؤن کی طرف چل دیے۔ راستے میں اُنہوں نے مجھے کئی بار یُوں گھُور کر دیکھا جیسے وہ مجھے کچّا ہی تو چبالیں گے۔ کیوں کہ مجھے اُن کی بات پر اعتبار ہی نہ آتا تھا۔ مَیں نے بھی اُن کی گھُرکیوں کی کوئی پروا نہ کی۔ آخر وہ خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ ذرا عُمر میں وہ ایک ڈیڑھ سال بڑے ہیں تو اِس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ مجھ سے جُوتیاں سیدھی کروائیں اور میرے بزرگ بن بیٹھیں۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہُوئی۔ نہ ڈاڑھی نہ مُونچھ، نہ سینگ نہ پُونچھ اور چلے ہیں بزرگ بننے۔ اُٹھا کر ایک پٹخنی دُوں۔ بھیّا جی کو تو سمجھ آ جائے کہ صابر کیا شے ہے۔ وہ تو مَیں اپنے نام کی لاج رکھتا ہُوں! ورنہ تو سیدھا کر کے رکھ دُوں انہیں۔

"یہ آپ مجھے خُونی خُونی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں جناب"، مَیں نے اُن کے بگڑے بگڑے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

"اسے سمجھالیں امّی جان، یہ ہر وقت میری بے عزّتی کرتا رہتا ہے"، شاکر صاحب نے بڑے غُصّے سے کہا۔

"ارے کمبختو، تانگے میں بھی لڑائی، گھر میں بھی لڑائی۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں مُونڈی کاٹو۔ ہر وقت گُتھم گُتھا ہوتے رہتے ہو۔ آرام سے بیٹھو" امّی جان نے ہمیں سختی سے ڈانٹتے ہُوئے کہا۔

"امّی جان، خواہ مخواہ انہوں نے تانگے کے پیسے ضائع کروائے

ہیں. بھلا کوئی تیس روپے میں ہمیں کوٹھی دے سکتا ہے ؟"

"دیکھا امّی جان' یہ مجھے جھوٹا سمجھتا ہے. اِس کا خیال ہے کہ میں تانگے میں سَیر کرنے نکلا ہُوں." وُہ تپ کر بولے.

"ارے صابر بیٹے' کبھی تو چَین سے بیٹھا کر. شاکر تجھ سے بڑا ہے اُس کا ادب کیا کر."

"ایک سال بڑے کیا ہو گئے بس دھونس ہی جماتے رہتے ہیں ہر وقت ——" مَیں نے جَل بھُن کر کہا. امّی جان بھی اُس کی ہی طرف داری کرتی تھیں.

تھوڑی دیر بعد تانگہ ایک کوٹھی کے سامنے جا ٹھہرا. اُس کوٹھی کے اِرد گرد کھیت ہی کھیت تھے. کوئی دو ڈھائی فرلانگ دُور مشرق کی جانب کچھ مکان بنے ہُوئے تھے. مغرب کی طرف فرلانگ بھر دُور ایک اور کوٹھی تھی جس کے پھاٹک کے سامنے دو بچّے کھیل رہے تھے.

"کوٹھی تو بڑی اچھّی ہے بیٹے' وُہ چوکیدار کہاں ہے؟" امّی جان نے خُوش ہو کر کہا.

"وُہ اندر ہی ہو گا. مَیں اُسے ابھی بُلاتا ہُوں." یہ کہہ کر شاکر بھائی پھاٹک تک جا پہنچے اور اُس کی سلاخوں میں پاؤں پھنسا کر دُوسری طرف کُود گئے. کچھ ہی دیر بعد وُہ چوکیدار کو ساتھ لے کر واپس آتے تو بہت خُوش نظر آتے تھے. چوکیدار نے پھاٹک کھولا اور ہم اللہ

کا نام لے کر اندر چلے گئے۔

وہ کوٹھی واقعی خوب صورت تھی۔ اگرچہ بہت پُرانی معلوم ہوتی تھی۔ پھر بھی وہ بڑی عمدہ حالت میں تھی۔ کمرے بڑے بڑے روشن اور ہوادار تھے۔ اُن کی اُونچی اُونچی چھتیں دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ درمیان میں ایک ہال تھا جو دُوسرے کمروں سے زیادہ بڑا اور روشن تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی چھت میں روشندان لگا ہُوا تھا۔

کوٹھی کو دیکھ کر امّی جان تو خوش ہو گئیں اور کھٹ سے تیس روپے نکال کر چوکیدار کو دیتے ہُوئے بولیں:

"بھائی یہ لو کرایہ، ہم اِس کی ہر طرح سے دیکھ بھال کریں گے۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ مگر ایسا نہ ہو کہیں کل کلاں کو تم نکال ہی دو۔ کوئی تمہیں زیادہ پیسے دے تو تم لالچ میں آجاؤ۔"

"نہیں بی بی جی، شاکر تو میرے بیٹے جمیل کا دوست ہے۔ اُس کو تو مَیں ناراض نہیں کر سکتا۔ آپ بے فکر ہو کر یہاں رہیں۔ آپ کو کوئی نہیں نکالے گا۔ آپ سامان لے آئیں۔ مَیں کل یہاں سے سامان نکال لُوں گا۔ مَیں یہاں سے نہ جاتا مگر لنڈا بازار بہت دُور پڑتا ہے اور اب مجھے دِن رات وہیں رہنا پڑے گا۔ اِس لیے وہیں مکان لے لُوں گا۔ آپ سے لے کر یہ تیس روپے وہاں دے دیا کروں گا۔"

امّی جان خوش ہو گئیں۔ وہ اُس چوکیدار کی گھر والی سے ملیں۔

اس کے دو ننھے مُنّے بچے تھے۔ انھیں بھی دیکھا۔ اُن سے اپنی محبت کے اظہار کے لیے امّی جان نے ایک ایک روپیہ اُن کے ہاتھ پر رکھا اور پھر ہم خوش خوش گھر لوٹ آئے۔ جمیل سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

جب ہم گھر پہنچے تو بھائی صاحب نے ایک بار پھر مجھے بڑے غصے سے گھور کر دیکھا اور بولے:

"کیوں بھئی، اب بھی تیری آنکھیں کھلیں کہ نہیں۔ بزرگوں کا مذاق اُڑاتا تھا تو — ملتی ہے نا تیس روپے میں کوٹھی؟"

"وہاں ضرور جن بھوت رہتے ہوں گے! ورنہ اتنے کرایے میں وہ کوٹھی مل ہی نہیں سکتی ہے!" میں نے کہا۔

"دیکھا امّی جان آپ نے۔ اب اسے جن بھوت یاد آنے لگے ہیں، بھوت جیسی تو اس کی اپنی شکل ہے!"

"بھوت کا بھائی بھی بھوت ہی ہوتا ہے!" میں نے جل کر کہا۔

"پھر تم دونوں لڑنے لگے ہو۔ خبردار جو کوئی بکواس کی تم نے تو — ماں جوتے ماروں گی تم دونوں کے سر پر!" امّی جان نے ہمیں ڈانٹا اور میں وہاں سے کھسک لیا۔ وہ میری کچھ زیادہ ہی مخالفت کیا کرتی ہیں۔ اب شاکر نے کوٹھی اتنے سستے کرایے میں دلا کر انھیں اور بھی اپنا طرف دار بنا لیا تھا۔

شام کو ابّا جان بھی جا کر وہ کوٹھی دیکھ آئے۔ جب واپس آئے

تو معلوم ہُوا کہ وہ تو شاکر بھائی کا مُنہ سَر چُومنے کو تیار ہیں۔ اُنہیں اپنے اِس لاڈلے پر بڑا پیار آ رہا تھا جس نے اُنہیں تیس روپے میں ایک کوٹھی دلا دی تھی۔ اب ہمیں اُس گھر میں کوئی پُوچھتا بھی نہ تھا۔ سب کے مُنہ پر شاکر صاحب کا ہی نام تھا۔ ہمیں سخت کوفت ہو رہی تھی۔

اگلے دن ہم سامان ریڑھے پر لاد کر ماڈل ٹاؤن جا پُہنچے اور کوٹھی پر قابض ہو گئے۔ چوکیدار اپنا سامان لے جا چُکا تھا۔ ایک مُدت بعد ہمیں رہنے کے لیے کھُلی جگہ مِلی تھی۔ جس پر ہم سب بے حد خُوش تھے۔ بھائی صاحب بولے:

"ہم تو سالم کمرہ اپنے لیے الگ کرلیں گے!"

"یعنی آپ کا مطلب ہے کہ آپ ایک کمرہ اُٹھا کر کہیں باہر لے جائیں گے"؛ مَیں نے کہا۔

"ابے تُو چُپ رہا کر صابر! ورنہ مَیں تیری ناک توڑ دوں گا۔ مَیں ادیب فاضل کی تیاری کر رہا ہُوں۔ ایک الگ کمرہ میرے پاس ہو گا تو آرام سے پڑھائی کر سکوں گا۔" وہ ایک دم غضب ناک ہو کر بولے۔

"ہاں ہاں، تجھے کیوں جلن ہے لڑکے، شاکر ٹھیک کہتا ہے۔ مَیں اُسے الگ کمرہ دُوں گی۔ بیٹے، اِس پہلو کے کمرے میں تُو اپنا سامان رکھ لے، شاباش میرا لال۔ یہ جگہ تیری ہمّت سے تو مِلی

ہے۔ تُو خواہ دو کمرے لے لے۔" امّی جان نے شاکر کو پچکارتے ہُوئے کہا۔

"تو پھر مَیں بھی الگ کمرہ لُوں گا۔ مَیں نویں جماعت میں پڑھتا ہُوں۔ آپ نے اگر نویں جماعت پڑھی ہوتی تو آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ کتنی مشکل جماعت ہوتی ہے۔" مَیں نے ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہُوئے کہا۔ اُن شاکر صاحب سے ڈرنے دبنے کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ ایک تو ویسے ہی دھان پان مریل سے دکھائی دیتے تھے۔ مگر رُعب یُوں جماتے تھے جیسے کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں بلکہ رستم زماں گاماں پہلوان کے بھائی کی پھوپھی کے بھانجے کے بھتیجے ہیں۔ میری بات بھلا امّی جان کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔ بڑے غصّے سے بولیں:

"ہاں ہاں، اِس دُنیا میں ایک تُو ہی بیچارا نویں میں پڑھ رہا ہے اور تو سب کے سب اَن پڑھ ہیں۔" وہ آٹھویں جماعت تک پڑھی ہُوئی تھیں۔ اِس لیے اُنھیں میری بات پر سخت حیرت ہُوئی۔

"صابر ٹھیک کہتا ہے بھئی شاکر کی ماں، تُو آٹھویں پاس عورت بھلا کیا سمجھ سکتی ہے کہ نویں کتنی مشکل ہوتی ہے۔" ابّا جان نے اِس مکالمے میں دِل چسپی لیتے ہُوئے کہا۔

"ہاں ہاں، مَیں تو ہُوں ہی پھوہڑ۔ ایک آپ نے منشی فضول

بی اے کیا کر لیا اب آپ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے ہیں —"
امّی جان نے ابّا کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"منشی فاضل کو تم منشی فضول کہتی ہو۔ یعنی ہم نے جو ولی سے لے کر اصفہان تک کے تمام عالموں کی کتابیں پڑھ کر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا تھا وہ تمہارے نزدیک منشی فضول ہو گیا۔ حد ہے بھئی شاکر کی ماں۔ تیرا جواب نہیں ہے۔" ابّا جان نے سخت بدمزہ ہو کر کہا۔

"پھر آپ اپنے لیے دو کمرے رکھ لیں کیوں کہ آپ منشی فاضل اور بی اے پاس ہیں۔" امّی جان نے کہا۔

"بس یہ ٹھیک ہے۔ دو کمرے میں لے لیتا ہوں۔ ایک میں شاکر اور ایک میں صابر رہیں گے۔ پانچواں کمرہ بیٹھک بنے گا۔ تم اُدھر برآمدے میں چق تان کر پڑ رہو۔ زندگی گزر ہی جائے گی۔" ابّا جان نے بڑی تفصیل سے اپنی تجاویز پیش کر دیں۔

"ہاں ہاں، مجھے تو آپ برآمدے میں بھی جگہ دے دیں تو بڑی مہربانی ہے آپ کی۔ میں اِس گھر کی جمعدارنی جو ٹھہری۔" امّی جان نے ناراض ہو کر کہا۔ وہ اُس وقت فرش پر جھاڑو دے رہی تھیں۔

# باب ۲

جب شام ہوئی اور ہم باورچی خانے سے اُٹھ کر الگ الگ کمروں میں جا کر لیٹ گئے تو مجھے یوں معلوم ہوا کہ میں مر چکا ہوں اور میرا مُردہ اُٹھا کر کسی نے اُس کمرے میں لا رکھا ہے جو اِتنا بڑا تھا کہ دیکھ کر ہول آتا تھا — ہمارے پاس سامان بڑا ہی مختصر سا تھا۔ میرے حصے میں ایک کُرسی اور ایک میز آئی تھی۔ وہ میں نے ایک کونے میں لگا لیے۔ اُس کے قریب ہی میں نے اپنا بستر بچھا لیا تھا۔ مگر باقی دس فٹ مربع جگہ بڈھے کے پوپلے منہ کی طرح بالکل خالی تھی۔ میرے بستر کے بالکل سامنے دو کھڑکیاں تھیں جن میں سے باہر کا برآمدہ اور اُس سے پرے کوٹھی کا لان دیوار تک صاف نظر آتا تھا۔ تازہ ہوا فر فر اندر آتی تھی۔ ساتھ کے کمرے میں میرے بڑے بھائی قبلہ جناب محمد شاکر صاحب رہائش پذیر تھے۔ درمیان کا ہال بالکل خالی تھا۔ وہاں سجانے کے لیے ہمارے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ ابّا جان اور امّی جان ایک ہی کمرے میں تھے اور اُن کا کمرہ ہال کے دوسری طرف دائیں ہاتھ کو تھا۔ کوٹھی میں پانی کا تو اچھا اور معقول انتظام تھا۔ کمیٹی کا نل سارا دن شاں شاں پانی دیتا تھا۔ مگر اُس رات بجلی فیل ہو گئی تھی جس کی وجہ

سے مَیں نے لیمپ جلا لیا تھا اور بھائی شاکر صاحب نے بھی ۔۔۔ تیسرا لیمپ جو ایک عرصے سے خراب ہو رہا تھا۔ اُسی شام ٹھیک کروانے کے بعد ابّا جان نے اپنے کمرے میں رکھ لیا۔

مَیں رات کو نئے مکان کی خوشی میں کافی دیر تک بیٹھا اپنی کتابیں پڑھتا رہا۔ امّی جان بھی اُس رات کافی دیر تک بیٹھی نماز پڑھتی رہیں۔ وُہ کوئی وظیفہ وغیرہ کیا کرتی تھیں اور اُس رات بھی وُہ نئے مکان کو جنّ بھوت کے اثر سے پاک کرنے کے لیے دیر تک وظیفہ پڑھتی رہیں۔

میرے اور بھائی شاکر صاحب کے کمروں کی درمیانی دیوار میں جو دروازہ تھا وُہ اُنھوں نے بند کر لیا تھا تاکہ مَیں اُن کے مطالعہ اور نیند میں کوئی خلل نہ ڈال سکوں۔ وُہ دراصل اُن دِنوں بزرگی کے مُوڈ میں تھے اور مجھے کسی گنتی شمار میں لیتے ہی نہ تھے۔ مَیں نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے حضُور، اپنا بھی اللہ حافظ ہے۔ زندگی کے دن کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائیں گے۔ آپ کو ہم سے ضد ہے تو ضد ہی سہی۔

تین دن اور تین راتیں اُس مکان میں بڑے آرام سے گزریں۔ ہم سب بے حد خوش تھے کہ ہمیں رہنے کے لیے اِتنا اچھا مکان اِتنے سَستے کرایے میں مل گیا تھا۔ امّی جان نے وہاں جگہ جگہ مصلّےٰ بچھا کر نماز پڑھی۔ جگہ جگہ دُعائیں مانگ کر پھُونکیں ماریں تاکہ ہوائی چیزوں کا اثر دُور ہو جائے۔ اب وُہ ہر طرح سے مطمئن تھیں کیونکہ

وہاں ہمیں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی تھی جس کا ذکر شمر نو کرتا تھا۔
چوتھی صبح جب ہم سو کر اُٹھے اور صبح صبح نماز پڑھنے کے بعد جب امّی جان باورچی خانے میں داخل ہوئیں تو وہاں عین چولہے کے سامنے فرش پر اُنہیں خون کے چھینٹے نظر آئے۔ وہ تو ایک دم دہل گئیں اور انہی قدموں پیچھے لوٹ آئیں۔ میں کمرے سے نکل کر برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ اُن کی گھبرائی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"ارے بیٹا، اِدھر تو آنا ذرا۔ اپنے ابّا کو بھی بُلا۔"

"کیا بات ہے امّی جان؟" میں بھاگ کر اُن کی طرف لپکا۔

"اُدھر باورچی خانے میں دیکھو۔ وہاں خون کے چھینٹے پڑے ہوئے ہیں۔" وہ بولیں اور مجھے باورچی خانے میں لے گئیں۔

وہاں چولہے کے سامنے فرش پر واقعی ڈھیر سارا خون پڑا تھا۔ کچھ چھینٹے دیوار تک پہنچے ہوئے تھے۔

"یہ خون یہاں کس نے پھینکا ہے؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"میں تو خود حیران ہوں بیٹے۔ دیکھو تو کیا تازہ تازہ خون ہے یہ جیسے کسی نے بکرا حلال کیا ہو۔" امّی جان بولیں۔

اِتنے میں ابّا بھی وہاں آ پہنچے اور بھائی شاکر صاحب بھی۔ وہ اُس خون کو دیکھ کر سخت حیرت زدہ ہوئے۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر

دیکھنے کے بعد ابا بولے :
"بھئی شاکر کی ماں، معلوم ہوتا ہے بلّی نے کسی جانور کو مار کر یہاں بیٹھ کے ہڑپ کیا ہے اور کوئی بات نہیں۔"
"واہ، اگر بلّی کسی مرغے وغیرہ کو مارتی تو اُس کے پَر تو یہاں نظر آتے۔" امّی جان نے کہا۔
"ہو سکتا ہے اُس نے کوئی چوہا مارا ہو یا کوئی خرگوش پکڑا ہو۔" ابا نے کہا۔
"مگر خرگوش یا چوہے میں اتنا خُون کہاں سے آیا؟" امّی نے کہا۔
"ہاں، یہ بھی سوچنے کی بات ہے اور پھر دروازہ کھُلا تھا یا بند؟"
"دروازہ باہر سے بند تھا اور میری عادت ہے کہ میں تالا ڈال دیتی ہُوں یہاں۔" امّی نے کہا۔
"تو تالا موجود تھا یہاں؟"
"ہاں ہاں تالا بالکل بند تھا۔ مَیں نے خود کھولا ہے اُسے۔" امّی نے کہا۔
"کمال ہے بھئی شاکر کی ماں، یہ بات تو بڑی حیران کُن ہے۔" ابا جان نے پریشان ہو کر کہا۔
"میرا خیال ہے کہ کسی چڑیل نے یہاں بیٹھ کر کسی کا کلیجہ بھُون کر کھایا ہو گا۔" مَیں نے اپنی حقیر رائے ظاہر کی۔

"ہاں ہاں، چڑیلیں اب ہانڈی چولہا تو کرتی پھرتی ہیں!" ابا جان نے کہا۔

"آپ کی کیا رائے ہے قبلہ جناب بھائی محمد شاکر صاحب!" میں نے بھائی صاحب سے کہا۔ کیونکہ وہی اس کوٹھی کے کولمبس تھے۔ وہ امریکہ انہی نے دریافت کیا تھا۔ چمک کر بولے:

"دیکھ لیں امی جان، یہ مجھے سیدھی طرح بھائی جان نہیں کہہ سکتا؟"

"میں نے غلط تو نہیں کہا۔ آپ ہی اِس مکان میں لائے ہیں نہیں۔ تین راتیں ہو گئیں، میں ایک پل نہیں سو سکا!" میں نے کہا۔

"مکان کا کیا قصور ہے۔ اِس میں۔ میں نے عالی شان کوٹھی میں پہنچا دیا ہے تجھے صابر کے بچے۔ یہ گاجر ہی تو نہیں پچا سکتا!" بھائی جان نے بڑے غصے سے کہا۔

"شاکر کے ابا کسی مولوی صاحب کو بلا لیں آج۔ وہ دَم جھاڑا کر کے دیکھیں کہ کیا بات ہے۔ اگر یہ مکان بھاری ہے تو ہم یہاں نہیں رہیں گے!" امی جان نے ہماری باتیں نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بس شاکر کی ماں، مولوی صاحب کیا کریں گے یہاں؟ میں آج خود جاگ کر دیکھوں گا کہ کیا قصہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی جانور کا کام ہے یہ!" ابا جان نے کہا اور ہال کمرے کا دروازہ کھول کر دوسری طرف چل دیے۔

"ارے شاکر کی ماں، ادھر آنا ذرا!" اُن کی گھبرائی ہوئی آواز ہمیں

سُنائی دی۔ ہم تیزی سے اُن کی طرف پلٹے تو اُنہیں دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ اُن کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا۔ کانپتے ہوئے بولے :

"وُہ..... وُہ دیکھو، وہاں بھی فرش پر خُون ہی خُون بکھرا نظر آتا ہے "

بھائی صاحب تو اتنے خوفزدہ ہوئے کہ اُنہوں نے کمرے میں پاؤں ہی نہ دھرا۔ مَیں لپک کر اندر پہنچا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں فرش پر خُون کے چھینٹے دُور دُور تک بکھرے پڑے تھے جیسے کسی نے رنگ کی پچکاریاں چلائی ہوں اور وہاں ایک کونے میں سیاہ بالوں کا ڈھیر اور کتنے سارے بڑے بڑے کٹے ہوئے ناخن اور کچھ ہڈیوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔

وُہ ساری چیزیں دیکھ کر میری تو رہی سہی گُم ہو گئی۔ مَیں نے دل میں کہا یا پیر دستگیر یہ کیا قصّہ ہے۔ یہ کوئی حجام کی دکان ہے یا کسی سری پائے بیچنے والے کا ٹھڑا کہ جہاں ہڈیاں پڑی رہیں جہاں بالوں اور ناخنوں کا ڈھیر اتنا اُونچا ہو گیا ہے۔

امّی جان ہمّت کرکے آگے بڑھیں تو وہ خُون اور ناخن اور بال دیکھ کر اُن کی بھی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں اور وُہ خوفزدہ ہو کر باہر نکل گئیں۔ تھوڑی دیر بعد شاکر بھائی بھی معائنہ کرنے کے لیے اندر تشریف لے گئے اور پھر آپ ہی آپ "حیرت ہے، کمال ہے" کا ورد کرتے ہوئے باہر آ گئے۔

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ ہم دیر تک باہر برآمدے میں بیٹھ کر اِس عجیب و غریب بات پر غور کرتے رہے مگر ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ سب چیزیں کہاں سے آئیں اور کس نے رکھی ہیں۔ امّی جان تو اِس نتیجے پر پہنچی تھیں کہ مکان واقعی آسیب زدہ ہے اور بھوت پریت ہمیشہ ایسی ہی نشانیاں دکھایا کرتے ہیں اور وہاں جو ہوائی چیزیں رہ رہی ہیں وہ بس چاہتی ہیں کہ اِس کوٹھی میں کوئی انسان آباد نہ ہو۔

کوئی نو بجے کے قریب تنگ آ کر ابّا جان بولے :

"بھئی شاکر کی ماں، روٹی تو پکاؤ۔ کب تک یونہی بیٹھی رہو گی۔ بچّوں کو بھوک لگی ہو گی!"

یہ بات سُن کر امّی جان باورچی خانے کی طرف بڑھیں جب آگ جلانے لگیں تو معلوم ہوا کہ لکڑیاں سب کی سب بھیگی ہوئی ہیں حیرت زدہ ہو کر بولیں :

"آئے ہائے، آگ لگے اِس کوٹھی کو۔ باورچی خانے میں لکڑیاں رکھی تھیں۔ نہ کوئی بارش ہوئی نہ کسی نے پانی ڈالا مگر وہ سب کی سب بھیگی پڑی ہیں!"

مَیں نے ایک لکڑی اُٹھا کر دیکھی تو وہ واقعی پانی میں تر ہو رہی تھی۔ دُوسری دیکھی اُس کا بھی یہی حال تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اُنہیں تالاب میں ڈال کر پانی میں خوب بھگو دیا ہے۔ بھائی صاحب نے بھی یہ طرفہ تماشا دیکھا اور سر جھکا کر باہر نکل گئے

اور ابا جان نے اس معاملے پر بالکل کوئی رائے نہ دی۔

مجبوراً تیل کا چولہا جلایا گیا اور پھر جوں ہی امی نے آٹا نکالنے کے لیے ٹین کھولا تو اُن کے ہاتھ تھر تھر کانپنے لگے۔ وہاں کسی جانور کی کھوپڑی پڑی تھی۔ کسی کتے یا بجرے کا سر تھا وہ۔ اُسے دیکھ کر تو ہمارے پسینے چھوٹ گئے۔

امی جان تو منہ ہی منہ میں کوئی آیت پڑھتی ہوئی باہر نکل کر لان کی گھاس پر جا بیٹھیں۔ اُن کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ہم بھی اُن کے پیچھے پیچھے باہر نکلے اور اُن کے قریب جا بیٹھے۔

"یہ تو بڑا ہی منحوس مکان ہے، اسے تو فوراً چھوڑ دینا چاہیے" قبلہ بھائی صاحب نے کہا۔

"میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا آپ کو مگر آپ نے کہا کہ کوٹھی مل رہی ہے۔ اس میں جن بھی ہوں تو کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے۔ امی جان نے بھی تو ساری باتیں سنی تھیں" بھائی صاحب بولے۔

"یہ سب بکواس ہے۔ مجھے تو یہ کسی آدمی کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہمیں اس مکان سے بھگا دینا چاہتا ہے" ابا جان نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"ہاں ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے ابّا جان، ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے"
بھائی صاحب نے شیر ہو کر کہا۔
"مُوا آدمی ہو تو سامنے نہ آئے۔ کسی کو اِس مکان سے کیا دِل چسپی ہو سکتی ہے۔ مکان تو کسی ہندو کا بنایا ہُوا معلوم ہوتا ہے جِسے اس آدمی نے الاٹ کرا لیا ہوگا" امّی جان نے کہا۔
"ہے تو یہ متروکہ جایئداد ہی مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ساری چیزیں کس نے یہاں رکھی ہیں" ابّا جان بولے۔
"کچھ بھی ہو شاکر کے ابّا، مَیں یہاں نہیں رہ سکتی" امّی جان نے کہا۔
"آنے کی بھی بڑی جلدی تھی۔ اب جانے کی بھی بہت جلدی ہے۔ دو چار دن رہ کر دیکھتے ہیں، کوئی ہمیں تو نہیں ڈال لے گا ہمیں"
"ہائے ہائے، تو آپ چاہتے ہیں ہم سب یہاں خوف سے ہی پاگل ہو جائیں۔ یوں ہی ہمیں کسی نے تیس روپے میں یہ کوٹھی نہیں دے دی۔ کوئی نہ کوئی مُصیبت تو ہے ہی نا یہاں، جب ہی کوئی یہاں ٹکتا نہیں ہے" امّی جان نے کہا۔
"اچھا دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔ اِتنے میں کوئی مکان مِل گیا تو ہم چھوڑ دیں گے اِسے۔ آؤ تم برآمدے میں بیٹھ کر کھانا پکاؤ" یہ کہہ کر ابّا جان ہم سب کو ساتھ لے کر برآمدے میں جا بیٹھے۔ اُنھوں

نے خود ہی باورچی خانے سے خون صاف کیا۔ خود ہی وہ کھوپڑی اُٹھا کر باہر پھینکی اور پھر ساری ضروری چیزیں اُنھوں نے برآمدے میں لا کر رکھ دیں۔ وہیں بیٹھ کر امّی نے کھانا پکایا اور وہیں بیٹھ کر ہم نے پیٹ کا دوزخ بھرا۔ مگر ہم سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ مجھے رہ رہ کر بھائی صاحب پر غصّہ آ رہا تھا کہ اُنھوں نے مکان بھی ڈھونڈا تو ایسا ڈھونڈا کہ یہاں چڑیلوں کا بسیرا تھا۔ اب یہ چھلاوے پائیاں بھلا انسانوں کو کہاں اپنے گھر میں رہنے دیتی ہیں۔ خدا جانے اُنھوں نے کب سے قبضہ جما رکھا تھا وہاں۔

اُس روز ابّا جان دفتر بھی نہ جا سکے۔ گھر میں ہی بیٹھے رہے۔ بھائی صاحب تو اپنے کمرے سے ساری کتابیں اور دوسری چیزیں اُٹھا کر امّی جان کے کمرے میں لے گئے۔ پھر بولے :

"اوئے صابر، تُو بھی اپنی چیزیں اُٹھا کر امّی جان کے کمرے میں رکھ دے۔ ہم میں سے کوئی بھی اب تنہا نہیں سویا کرے گا۔ پتا نہیں کس وقت کیا ہو جائے۔"

"اگر آپ نے یہی کرنا تھا تو اِس مکان میں آپ ہمیں لائے ہی کیوں ہیں۔ میں تو اسی کمرے میں سوؤں گا، دیکھوں گا کون چڑیل مجھے اُٹھا لے جاتی ہے۔" میں نے ذرا ڈٹ کر کہا۔ دل میں مَیں نے تہیہ کر لیا تھا کہ مَیں رات کو اپنے ہی کمرے میں سوؤں گا اور یہ دیکھ کر رہوں گا کہ چڑیلیں کیسی ہوتی ہیں۔

"سن لیا آپ نے امّی جان. بڑے بہادر بنے پھرتے ہیں ننھے میاں،
چڑیلیں تو کلیجہ نکال لیتی ہیں لوگوں کا۔" بھائی صاحب بولے۔
"نہ نہ بیٹا، ایسی بُری بات مُنہ سے نہ نکال۔ خُدا بُری گھڑی
سے بچائے۔ صابر بیٹا، تُو ہمارے ہی کمرے میں سوئے گا آج۔" امّی جان
نے کہا۔ وہ سخت گھبرائی ہُوئی تھیں۔

انہوں نے زبردستی میرے کمرے سے میری ساری چیزیں اُٹھوا
کر اپنے کمرے میں پہنچا دیں۔ چار کرسیاں اور تین میز ہم نے بڑے
قرینے کے ساتھ ہال کمرے کے عین بیچ میں رکھ دیے۔ کیوں کہ وہاں
وہ بہت موزوں نظر آتے تھے۔

رات کو کھانا کھا کر ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر
کوئی گیارہ بجے بتیاں بجھا کر ہم سب سو گئے۔ دل میں یہی دھڑکا لگا
تھا کہ خُدا خیر کرے۔ صبح خدا جانے اس کوٹھی کے کس کس کمرے
میں کیا کیا کچھ نظر آئے گا۔

ابا جان کے خراٹوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ امّی جان بھی
سو چکی تھیں اور بھائی صاحب بھی شاید سو ہی چکے تھے۔ کیوں کہ دیر تک
کروٹیں بدلنے کے بعد اب وُہ سکون سے لیٹے تھے۔ کھُلی کھڑکیوں میں
سے تازہ ہوا فر فر اندر آ رہی تھی اور گرمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔
جب سے ہم اس کوٹھی میں آئے تھے تب سے ہمیں باہر سونے
کی ضرورت ہی محسوس نہ ہُوئی تھی۔ کیوں کہ تمام کمروں میں ہوا کا گزر

آر پار ہوتا تھا اور رات مزے سے گزر جاتی تھی ۔ وہ سب سو چکے تھے مگر نیند مجھ سے ابھی تک کوسوں دُور تھی۔

اچانک مجھے محسوس ہُوا جیسے کوئی سامنے کی کھڑکی کی جالی کے ساتھ لگ کر برآمدے میں کھڑا ہے ۔ باہر چاندنی چھٹکی ہُوئی تھی اور کمرے میں اگرچہ بتی بجھی ہُوئی تھی پھر بھی اندھیرا نہیں تھا کیونکہ گیارھویں کا چاند پُوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ مَیں نے سوچا یہ میرا وہم ہے۔ مگر جب مَیں نے ذرا غور سے کھڑکی کی طرف دیکھا تو میرا وہم یقین میں بدل گیا۔ کھُلی کھڑکی کی جالی کے ساتھ لگ کر کوئی کھڑا تھا میرے تو رونگٹے کھڑے ہونے لگے ۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ سایہ تھا جو آہستہ آہستہ جالی کو اندر کی طرف دھکیل رہا تھا۔ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں تھیں۔ مَیں نے سوچا وہ سلاخیں توڑ کر تو اندر نہ آسکے گا مگر خوف کے مارے میرے مُنہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔

مَیں ایک دم بستر سے اُٹھ کر بھائی صاحب کی طرف لپکا تو وُہ سایہ تیزی سے غائب ہوگیا۔ بھائی صاحب گہری نیند میں کھوئے ہُوئے تھے۔ مَیں نے جب سائے کو غائب دیکھا تو میرا کچھ حوصلہ بندھا۔ مَیں نے بھائی صاحب کو بڑی نرمی سے ہلایا تو وُہ ایک دم چونک کر اُٹھے۔

"کیا ؟ کیا بات ہے صابر ؟" وہ گھبرا کر بولے۔

"کھڑکی میں کوئی سایہ حرکت کر رہا ہے۔" مَیں نے کہا۔ وہ ایک دم اُٹھ بیٹھے اور تکیے کے نیچے رکھا ہُوا چھوٹا سا چاقو ہاتھ میں پکڑ کر

دبی آواز میں بولے :

"کہاں ہے وہ سایہ ؟"

"ذرا آہستہ بولیں۔ شاید وُہ پھر نظر آجائے " میں نے کہا اور اُن کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر تک ہم ٹکٹکی باندھ کر کھڑکی کی طرف دیکھتے رہے مگر وُہ سایہ پھر وہاں نظر نہ آیا۔ کوئی دس منٹ بعد کسی نے دروازے پر دستک دی۔ وُہ ایسی پُر اسرار دستک تھی کہ ہمارا خُون خُشک ہو گیا۔ بھائی صاحب بھاگ کر ابا جان کی چارپائی پر چلے گئے۔

"کیا ہے ؟ کیا بات ہے بیٹا ؟" ابا جان نے ہڑبڑا کر اُٹھتے ہُوئے کہا۔

"کک کک، کوئی دو، دو، دستک دے رہا ہے " وہ ہکلاتے ہُوئے بولے۔

" دستک ؟ کون دستک دے سکتا ہے اِس وقت ؟" ابا جان بولے۔

تھوڑی دیر تک کمرے میں مکمل خاموشی طاری رہی۔

اچانک کسی نے دروازے پر بڑے زور سے دستک دی۔ اس پر امّی جان بھی جاگ اُٹھیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اُٹھ کر پُوچھ سکے کہ کون دستک دے رہا ہے۔ امّی جان تھر تھر کانپتی ہُوئی ابا جان کے پلنگ پر جا بیٹھیں۔

"کک ۔ کک، کون ہے ؟" بھائی صاحب نے بڑی مشکلوں سے کہا۔ اُن کی آواز تھرّا رہی تھی۔

مُصیبت یہ تھی کہ جس دروازے پر دستک ہو رہی تھی اُس طرف کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ ایک بار پھر دستک ہُوئی تو میں بے تحاشا اُٹھا اور دروازہ کھولنے لگا۔ مگر ابّا جان نے پیچھے سے مجھے پکڑ لیا اور دبی زبان میں بولے۔

"دروازہ مت کھولو بیٹے، اللہ جانے کون ہے کوئی چور ڈاکو ہُوا تو پھر ؟"

مَیں نے ہاتھ روک لیا اور پھر واپس آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

ابھی مجھے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہُوئے ہوں گے کہ اچانک دوسرے دروازے پر دستک ہُوئی۔ وُہ دروازہ ہال کمرے میں کُھلتا تھا۔ اب تو امّی جان خوف سے تھر تھر کانپتی ہُوئی آیۃ الکرسی پڑھنے لگیں۔ ابّا جان بھی مُنہ ہی مُنہ میں اُسی آیت کی تلاوت کرنے لگے۔ ہمیں کوئی دُعا یاد ہی نہ تھی۔ اِس لیے بیٹھے خوف سے تھر تھر کانپتے رہے اور سوچتے رہے کہ اب کیا ہو گا۔

"ٹھک۔ ٹھک۔ ٹھک !" ایک بار پھر دستک سنائی دی۔ اُسی دروازے پر جو ہال کمرے میں کُھلتا تھا۔

"کک۔ کون ہاتے ؟" ابّا جان نے ایک دم پلنگ سے اُٹھتے ہُوئے بلند آواز سے پُوچھا۔

"ہائے اللہ دروازہ نہ کھولیں!" امّی جان نے چلّا کر کہا۔ یہ بات سُن کر ابّا جان واپس مُڑے اور بتّی جلا دی۔ جب روشنی ہوئی تو مجھے بھائی صاحب کی صُورت دیکھ کر بڑا ترس آیا۔ وہ چادر لپیٹ کر پلنگ پر یُوں اکڑوں بیٹھے تھے جیسے اولے برس رہے ہوں اور اُن سے بچنے کے لیے اُنھوں نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا ہو۔ رنگ اُن کا ہلدی ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُسی کمرے میں سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی جیسے کوئی بسترِ مرگ پر پڑا ہو۔ پھر یُوں معلوم ہُوا جیسے کوئی عورت بلند آواز سے چیخ رہی ہے۔ ہائے ہائے کی آوازیں ٹھہر ٹھہر کر دُوسرے کمرے سے سُنائی دے رہی تھیں اور ہم سب ایک ہی پلنگ پر یُوں دبک کر بیٹھے تھے جیسے ابھی کوئی کونے سے نکل کر ہماری بوٹی بوٹی الگ کر دے گا۔ امّی جان اب بلند آواز سے آیۃ الکرسی پڑھ رہی تھیں۔ ابّا جان کو بھی کلام اللہ میں سے جو کچھ یاد تھا برابر پڑھ پڑھ کر ہم پر پھُونک رہے تھے۔

کچھ دیر تک تو وہ کراہنے کی آوازیں سُنائی دیتی رہیں پھر ایک دم مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔

"شاکر کے ابّا! اِس مکان کو چھوڑ دیں! ورنہ ہم پاگل ہو جائیں گے!" امّی جان نے کہا۔

"ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے۔ کل کوئی مکان دیکھوں گا!" ابّا جان

بولے۔

"میرا خیال ہے کہ ہم باہر نکل کر دیکھیں کہ قصّہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"بس بس بیٹا، خدا جانے وہ کیا چیز ہے۔ اللہ کے کلام کا اثر ہُوا ہے۔ اب وہ چُپ ہوگئی ہے۔ شاکر کے ابّا باہر نہ جائیں۔"

"نہیں نہیں، مَیں باہر نہیں جاؤں گا بھئی۔ چلو شاکر اب لیٹ جاؤ۔" ابّا جان بولے۔

ہم نے اپنی چارپائیاں ایک دُوسرے کے قریب گھسیٹ لیں اور چُپ چاپ لیٹ گئے۔ بھائی صاحب تو یُوں خاموش تھے جیسے وہ زندگی بھر منہ نہیں کھولیں گے۔ وُہ تو بس مجھ پر ہی دھونس جمانا جانتے ہیں۔ مزہ تو تب ہے کہ اُٹھ کر دیکھیں اور مردوں کی طرح حالات کا جائزہ لیں مگر نہیں، وُہ یُوں دُبک کر بیٹھے تھے جیسے بے چارے مُنہ میں دانت ہی نہیں رکھتے۔

خوف کی وجہ سے اچانک بھائی صاحب کے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگا اور وہ بولے:

"امّی، میں بیت الخلا میں جاؤں گا۔ میرے پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہے ہیں۔" بھائی شاکر صاحب نے بڑی مریل سی آواز سے کہا۔

"آپ کو اسی وقت باہر جانے کی سُوجھی ہے۔ وہ لمبے لمبے دانتوں والی چڑیل باہر کھڑی ہوگی۔" مَیں نے کہا۔

"تو چپ رہ صابر۔ ہماری جان پر بنی ہوئی ہے اور تجھے مذاق سوجھ رہے ہیں۔" امی بولیں۔

"تو پھر اب بھائی صاحب قبلہ کو لیٹرین تک کون لے جائے گا؟" میں نے کہا۔

"اوئے صابر تو سیدھا بھائی جان نہیں کہہ سکتا۔ ہر بات پر تو شاکر کو اسی طرح بلاتا ہے۔ کبھی قبلہ بھائی صاحب، کبھی جناب بھائی محمد شاکر صاحب ــــ چل بیٹے اٹھ، میں تیرے ساتھ چلتا ہوں ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔" ابا جان نے بڑے حوصلے سے کہا۔

"تو چلیں پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھا تو بھائی صاحب بھی ہمت کر کے اٹھ بیٹھے اور ابا جان نے اللہ کا نام لے کر دروازہ کھول دیا۔

# باب ۳

برآمدے میں سے گزر کر جب ہم دائیں ہاتھ پاخانے کی طرف بڑھے تو اچانک مجھے ایک سایہ تیزی سے مکان کی پچھلی طرف بڑھتا نظر آیا۔ میں نے غور سے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو یوں لگا جیسے کوئی پندرہ فٹ اُونچا آدمی سیاہ لبادہ اوڑھے چل رہا ہے۔ خوف کی ایک تیز لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ شاکر بھائی تو اندر جا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور ہم باہر پہرہ دینے لگے تھوڑی ہی دیر بعد وہ سایہ پھر لان میں نمودار ہُوا۔ مَیں نے ابّا جان کو ادھر متوجہ کیا تو وہ ایک دم آیۃ الکرسی پڑھنے لگے۔ ہم دیوار کے ساتھ چمٹ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سایہ تیزی سے مکان کی طرف لپکا اور برآمدے میں غائب ہو گیا۔ انگوروں کی بیل نے اس جگہ تاریکی پھیلا رکھی تھی۔ مجھ پر تو ایسا خوف طاری ہُوا کہ مَیں ایک دم دیوار سے ہٹ کر کمرے کی طرف بھاگا۔

جُوں ہی مَیں برآمدے کے کونے میں پہنچا دُوسری طرف سے کوئی شَے پُوری قوّت سے میرے ساتھ ٹکرائی اور مَیں دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اچانک اُس شَے نے تڑاخ سے ایک مُکّا میرے جبڑے پر

رسید کیا جس سے میں تیورا کر اُس کے قدموں میں جا گرا۔ میں نے تیزی سے اُس کی ٹانگیں پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر وہ تو ایسی بلا تھی جس کا میں کسی طرح بھی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ مجھے دونوں پاؤں سے پکڑ کر اُس نے اُوپر اُٹھایا۔ برآمدے سے باہر گھاس پر یوں پھینک دیا جیسے کوئی ہلکی سی گٹھڑی کو اُٹھا کر یہاں سے وہاں پھینک دے۔ میرے سر میں چوٹ لگی مگر میں نے کوئی آواز نہ نکالی بالکل چُپ رہا۔ وہ سایہ ہال کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھسا تو میں بھی بھاگ کر اُس کے پیچھے لپکا۔ دروازہ دیکھا تو وہ بند ہو چکا تھا۔ میں نے کھڑکی کی جالی میں سے اندر جھانک کر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ مُکا جو میرے مُنہ پر لگا تھا اُس سے میں صاف سمجھ چکا تھا کہ وہ کسی انسان کا ہاتھ تھا۔ ٹانگیں بھی میں دیکھ چکا تھا وہ بھی دو ہی تھیں اور وہ ریشمی کپڑے میں لپٹی ہوئی تھیں۔

میں بھاگ کر امی جان کے پاس پہنچا اور تیزی سے کہا:

"امی جان، وہ چڑیلیں نہیں ہیں کوئی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے میرے مُنہ پر مُکا بھی مارا ہے۔ اُس کی دو ٹانگیں بھی ہیں۔"

"مُکا مارا تھا تیرے مُنہ پر؟ خُدا تیرے حال پر رحم کرے بیٹا۔ تجھے کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟" امی جان نے ایک دم پریشان ہو کر کہا۔

"نہیں نہیں امی جان، چوٹ کوئی نہیں لگی۔" یہ کہہ کر میں نے ہال کمرے کا وہ دروازہ جو ہمارے کمرے میں بھی کھلتا تھا۔ ایک دم

آگے بڑھ کر کھولنے کی کوشش کی مگر وہ دُوسری طرف سے بند تھا۔

"ارے یہ دروازہ تو ہم نے خود اِس طرف سے بند کیا تھا!" مَیں نے حیران ہو کر کہا۔

"تُو کیا کر رہا ہے صابر بیٹے، آرام سے بیٹھ جا!" امّی جان نے کہا۔

"نہیں نہیں امّی جان، مَیں اس آدمی کو پکڑنا چاہتا ہُوں۔ وُہ چڑیل یا بھوت نہیں ہے بلکہ کوئی انسان ہے!" یہ کہہ کر مَیں دُوسرے کمرے میں گھُسا۔ امّی جان میرے پیچھے آئیں۔ ہم نے دونوں کمروں کی بتیاں روشن کر دیں۔ اُس کمرے میں جو دروازہ تھا وہ بھی ہال کمرے میں کھُلتا تھا۔ مَیں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اُس کے دونوں پٹ کھول دیے۔ ہال کمرے کی نیم تاریک فضا مجھے بڑی ہی پُر اَسرار معلوم ہو رہی تھی۔ وہاں ہماری کُرسیاں اور میز موجود نہیں تھے اُن کی جگہ ایک سایہ سا وہاں بیٹھا تھا۔ جُوں ہی دروازہ کھُلا ایک زوردار دھماکہ پیدا ہُوا اور کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ اب ہمیں وہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ مَیں نے دیوار پر ہاتھ مار کر بتی جلا دی مگر کمرے میں دھواں اِتنا زیادہ تھا کہ کوئی چیز صاف نظر نہیں آتی تھی۔

امّی جان نے مجھے ایک دم باہر کھینچ لیا۔

"او خدایا، ہم کس مُصیبت میں پھنس گئے ہیں!" وُہ خوف زدہ لہجے میں بولیں۔

اِتنے میں بھائی شاکر صاحب اور اَبّا جان بھی واپس آ گئے۔

"تم کہاں گئی ہو بھئی شاکر کی ماں؟" اَبّا جان نے دُوسرے کمرے سے پکار کر کہا۔

"اِدھر تو آ کر دیکھیں کیا ہو رہا ہے یہاں؟" امّی جان نے کھاؤں کھاؤں کھانستے ہُوئے کہا۔

جُوں ہی ابّا اندر آئے اور اُنھوں نے ہال میں پھیلے ہُوئے دھوئیں پر نظر ڈالی تو وہ ایک دم سناٹے میں آ گئے۔ کتنی ہی دیر تک اُن کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

"یہ کیا قِصّہ ہے شاکر کی ماں، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔" آخر وُہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہُوئے بولے۔

"یہ مکان ہی منحوس ہے، مَیں یہاں ایک منٹ نہیں رہ سکتی۔" امّی جان نے کہا۔

"ارے تو نہ رہو، میرے کوئی باپ دادا کا مکان تو نہیں ہے یہ۔" ابّا جان نے کہا۔

"صابر کے مُنہ پر کسی نے مُکّا رسید کیا۔ ابھی باہر برآمدے میں سے کسی نے اُٹھا کر اِسے باہر گھاس پر پھینک دیا تھا۔" امّی جان نے کہا۔

"اچھا، کوئی چوٹ تو نہیں آئی تجھے؟" شاکر بھائی بولے۔

"آپ اپنا مروڑوں کا شوق پُورا کرتے رہیں خواہ کسی کی جان

ہی چلی جائیے !" مَیں نے بھائی صاحب سے کہا۔
"تو مَیں کوئی شوق سے گیا تھا وہاں" بھائی صاحب بولے۔
"مروڑ آپ کو اسی وقت لگنے تھے۔ اِس کمرے سے ہماری میز کرسیاں بھی غائب ہیں !" مَیں نے کہا۔
"کیا کہا ؟ میز کرسیاں بھی غائب ہیں۔ وُہ کون لے گیا ہے ؟" ابّا جان نے کہا۔
"کوئی پتا چلتا ہے یہاں کیا اندھیر مچا ہے۔ صابر کہتا ہے کہ کوئی آدمی ہے یہاں۔ مگر آدمی کا یہاں کیا کام ؟ یہ تو کوئی ہوائی چیز ہے" امّی جان نے کہا۔
اِتنی دیر میں دُھواں کم ہو چکا تھا۔ جب ہم اندر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں سے کرسیاں اور میز واقعی غائب تھیں اور فرش پر خون بکھرا ہُوا تھا۔ تازہ تازہ خون اور اُس کے قریب ہی دو لمبے لمبے دانت پڑے تھے جیسے وُہ کسی وحشی جانور کے دانت ہوں۔ اُن پر بھی خون لگا تھا۔ قریب ہی دو چوہے مَرے پڑے تھے۔ باقی کمرہ جوں کا توں تھا۔ الماریاں بند تھیں۔ دروازے بھی سب کے سب اندر سے بند تھے اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ سایہ کہاں گیا۔ اُس نے اِتنا سارا دُھواں کہاں سے پیدا کیا وُہ مَرے ہُوئے چوہے وہاں کس طرح آ گئے اور وُہ دانت وہاں کس نے رکھے تھے۔ یہ ساری باتیں ہمارے لیے طلسم ہوشربا سے کسی طرح

بھی کم نہ تھیں۔ امّی جان کا خوف کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ شاکر بھائی بھی گُم سُم کھڑے تھے؛ البتہ ابّا جان برابر ان معاملات پر غور کر رہے تھے اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے خوف پر کافی حد تک قابُو پا چکے ہیں۔

ابھی ہم وہاں کھڑے ان معاملات پر غور کر ہی رہے تھے کہ اچانک ہمارے قریب ہی سے کسی کی چیخوں کی آواز سُنائی دی جیسے کوئی بوڑھی عورت درد سے نڈھال ہو کر چیخ رہی ہو۔ ہم تو ایکدم سُن ہو گئے۔ کیوں کہ کمرے کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف ایک دروازہ کُھلا تھا جو دُوسرے کمرے میں کھلتا تھا اور وہ آواز اُسی کمرے سے آ رہی تھی۔

"ذاکر بھائی آ جا تجھے قبر بُلاتی ہے۔" اُس آواز نے چیخ کر کہا۔ یوں معلوم ہُوا جیسے کوئی بَین کر رہا ہو۔ ذاکر میرے ابّا جان کا نام ہے۔ یہ الفاظ سُن کر تو امّی جان نے میرے ابّا کو بازو سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ ہم بھی تیزی سے باہر بھاگے تو وہ آواز پھر اُبھری جیسے کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہو۔

"مجھے چھوڑ کر کہاں جاتے ہو ذاکر بھائی، میں قبر میں اکیلی ہُوں۔" ہمیں یُوں محسوس ہُوا جیسے کوئی مُردہ اپنے سُوکھے سڑے ہاتھ پھیلا کر ہماری طرف بڑھ رہا ہو۔

"میں نہ کہتی تھی شاکر کے ابّا، یہ مکان منحوس ہے۔ خُدا کے

لیے ابھی یہاں سے نکل چلیں"۔

"پاگل ہوئی ہو۔ میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں یہ میری بہن کہاں سے پیدا ہوگئی ہے"۔

"میں۔ تیری .......... سگی بہن ہوں، ذاکر بھائی۔ مجھ سے قبر سوال کرتی ہے، مجھے عذاب دیتی ہے۔ میرے پاس آجاؤ میرے بھائی"۔ وہ آواز پھر ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ بالکل ہمارے قریب ہی سے بول رہی تھی مگر ہم اسے بالکل ہی نہ دیکھ سکتے تھے۔ دونوں کمروں کے بلب روشن تھے۔ مگر وہ بڑھیا ہمیں کہیں نظر نہ آتی تھی۔ وہ ہماری باتیں بخوبی سُن رہی تھی اور زندہ انسانوں کی طرح انہیں سوچ سمجھ کر جواب دے رہی تھی۔

ہم خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے کوٹھی سے باہر نکل کر لان کی گھاس پر جا بیٹھے۔

"شاکر کے ابا! اس موئے چوکیدار کو ہی بُلا لو"۔ امّی جان نے کہا۔

"نہیں، ہم کسی کو بھی نہیں بلائیں گے۔ صبح تک سونا تو نصیب میں نہیں ہے۔ مگر میں ان چڑیلوں سے ڈر کر کہیں نہیں جا سکتا"۔ ابا جان نے بڑے پُرعزم لہجے میں کہا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خوفزدہ تو ضرور ہوتے تھے۔ مگر پھر اپنے حواس پر قابو پا لیتے تھے۔

جب ہم لان سے باہر نکل گئے تو اس بڑھیا کی آواز بھی بند ہوگئی۔ شاکر صاحب میرے بالکل قریب ہی بیٹھے تھے، میرے کان

کے قریب مُنہ لاکر بولے :

"تیرے مُنہ پر مُکّا جو لگا تھا تو وُہ کس قسم کا تھا ؟"

"مُکّے کی بھی کوئی قسمیں ہوتی ہیں، جناب بھائی صاحب۔ مُکّا بس مُکّا ہی ہوتا ہے اور وُہ بھی ایک زور دار مُکّا ہی تھا جس نے مجھے زخمی کر دیا :"

"ہم.... ہم..... میرا مطلب ہے کہ کسی انسان کا مُکّا تھا وُہ یا کسی اور چیز کا ؟" وہ گھبرا کر بولے۔

"یہ کیا کھُسر پھُسر کر رہے ہو تم ؟" امّی نے ہمیں ڈانٹتے ہُوئے کہا۔ اُس وقت اُنہیں ہماری آوازیں بہت ہی کھل رہی تھیں۔

رات کے اس پچھلے پہر کے گہرے سناٹے میں کوٹھی کا ماحول بڑا ہی پُر اَسرار دکھائی دیتا تھا اور ہم یتیموں کی طرح لان میں بے آسرا ہو کر بیٹھے تھے۔

"بولتے کیوں نہیں ہو تم ؟" امّی جان نے پھر پُوچھا۔

"جی امّی جی، یہ اپنے قبلہ جناب بھائی محمّد شاکر صاحب ہیں نا۔ یہ پُوچھتے ہیں کہ وُہ مُکّا کس قسم کا تھا ؟" مَیں نے دبی زبان سے کہا۔ خوف سے میری بھی بُری حالت تھی۔ مگر قبلہ بھائی صاحب کا لٹکا ہُوا چہرہ دیکھ کر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ وُہ بڑے بہادر بنا کرتے تھے کہتے تھے ہم یہ کر سکتے ہیں، ہم وہ کر سکتے ہیں مگر اب وُہ یُوں بیٹھے تھے جیسے وُہ سب کچھ ہار چکے ہوں۔ بار بار سر پر ہاتھ پھیرتے

تھے جیسے اولے برس رہے ہوں اُن کے سر پر — اور پیٹ میں
اُن کے ایسے مروڑ اُٹھتے تھے کہ وُہ بار بار پاخانے کے خواب دیکھتے
تھے۔

"دیکھا تم نے یہ بدذات اِس وقت بھی شرارت سے باز نہیں
آتا۔ شاکر کو تو یہ کچھ سمجھتا ہی نہیں ہے" ابا جان نے اپنا دھیان
بدلتے ہوئے کہا۔ اُنہیں اِس وقت ہماری باتوں سے بڑا سہارا مل
رہا تھا۔

"ابا جی، یہ — یہ ہر وقت مجھے قبلہ کعبہ بناتا رہتا ہے۔ اسے
سمجھائیں، یہ مجھ سے بڑا تو نہیں ہے" شاکر بھائی نے گھاس پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے شکوہ کیا۔

"بڑے تو بنے جاتے ہیں۔ لو وُہ چڑیل پھر نظر آرہی ہے۔ ارے
کمرے میں تو آگ لگ گئی ہے" میں نے برآمدے کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔ جہاں ہم نے بستر بچھائے تھے اُس کمرے میں آگ جلتی دکھائی
دے رہی تھی۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آرہا۔

"ہائے اللہ، یہ کیا مصیبت ہے شاکر کے ابا۔ کمرے میں تو
آگ لگ گئی ہے" اماں جان نے سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے کہا۔

"یہ رات تو بڑی خوفناک ہو گئی ہے شاکر کی ماں، تم ٹھہرو میں
جا کر دیکھتا ہوں" ابا جان نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے بس خدا کے لیے اندر نہ جائیں جلنے دیں جو کچھ جلتا

ہے ہماری جانیں بچ جائیں یہی کافی ہے، بس میرا مولا صبح تک مجھے مہلت دے دے" امّی جان نے ابّا جان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں روکتے ہوئے کہا۔

"ہمیں وہ آگ بجھا دینی چاہیے امّی جان" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ کیوں کہ آگ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ابّا جان نے بھی اپنا ہاتھ چھڑایا اور وہ مجھے ساتھ لے کر تیزی سے کمرے کی طرف لپکے۔

کھلے دروازے میں سے جب ہم اندر داخل ہوئے تو اچانک کمرے میں ٹھک جیسی زور دار آواز پیدا ہوئی۔ جیسے کسی نے بڑے دھماکے کے ساتھ دروازہ بند کیا ہو۔

میرا بستر بری طرح جل رہا تھا اور آگ کے شعلے امّی جان کے بستر تک پہنچ رہے تھے۔ وہاں پانی کا گھڑا بھرا رکھا تھا۔ وہ اٹھا کر میں نے جلدی سے اپنے بستر پر انڈیل کر وہ آگ بجھائی؛ ورنہ ہم سب کے بستر اور چارپائیاں جل کر راکھ ہو جاتیں۔

ادھر سے فارغ ہو کر ہم نے ایک نظر ہال میں جھانک کر دیکھا تو وہاں وہ مرے ہوئے چوہے اور وہ دانت موجود نہیں تھے اور کمرے کے فرش پر سے خون کے دھبے بھی کافی حد تک مٹ چکے تھے جیسے کسی نے گیلا کپڑا پھیر کر خون صاف کر دیا ہو۔

"کمال ہے بھئی۔ وہ بھی کوئی سخت بزدل آدمی ہے جو یہ بھوتوں کا ناٹک رچا کر بیٹھا ہے۔ ارے بھئی، تم جو کوئی بھی ہو میدان

ہیں آکر ذرا ہم سے دو دو ہاتھ کر لو تو ہمیں بھی حسرت نہ رہے کہ اپنے مہربان کو دیکھ نہ سکے "! ابھی یہ بات اُن کے مُنہ ہی میں تھی کہ ایک بڑا سا پتھر عین اُن کے پاؤں کے قریب آکر گرا۔ وُہ دہل کر ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔

"ہم...... تمہارا زن بچّہ کولھُو میں پلوا دیں گے ذاکر علی' ہم سے گُستاخی کرتا ہے تُو"! ایک بھاری بھرکم خوفناک آواز فضا میں اُبھری اور اس کے ساتھ ہی ساری بتیاں بُجھ گئیں اور پھر ہم پر تڑ تڑ اینٹیں برسنے لگیں۔ ابا جان مجھے کھینچتے ہُوئے باہر کی طرف بھاگے۔ تو کوٹھی کے سارے کمروں سے قہقہوں کی آوازیں سُنائی دینے لگیں جیسے وہ ہماری سراسیمہ حالت پر ہنس رہے ہوں۔

ہم بھاگ کر برآمدے سے نکل کر لان میں جا پہنچے۔ وہاں بھی گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اُس تاریکی میں ہمارے لیے یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا کہ بھائی شاکر صاحب اور میری امّی جان کہاں بیٹھے تھے۔ ہم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا مگر ہمیں وہ دونوں لان میں کہیں نظر نہ آتے تھے۔ ابا جان نے گھُٹی گھُٹی آوازیں میں بھائی شاکر کو آواز دی۔ مگر اُنہیں کوئی جواب نہ ملا۔ اُن کی جیب میں ماچس تھی۔ وُہ اُنہوں نے جلا کر دیکھا تو لان سے پرے کوٹھی کے جنگلے کی دیوار کے قریب ہمیں دو گٹھڑیاں سی نظر آئیں۔ ہم دوڑ کر وہاں تک پہنچے تو معلوم ہُوا کہ میری امّی جان اور شاکر بھائی نیم بے ہوش

پڑے ہیں۔ اُن کے گلے میں ہمیں عجیب سے سیاہ ہار دکھائی دیے۔ ابا جان نے ماچس جلا کر جو دیکھا تو اُن دونوں کے گلوں میں ہمیں سانپ ہار کی صورت میں لٹکتے ہوئے نظر آئے۔ وہ سانپ دیکھ کر تو ہمارے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ ذرا اور غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ مرے ہوئے سانپ ہیں جو اُن کے گلوں میں لٹک رہے ہیں اور اُن کی دہشت سے وہ دونوں نیم بے ہوش پڑے تھے۔ اُن کے مُنہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

ابا جان نے اُن کے گلوں سے سانپ ہاتھ میں پکڑ کر دُور پھینک دیے اور اُن کو بڑی مشکلوں سے سر پر مالش کر کر کے ہوش میں لائے۔

"وُہ ..... وُہ دیو کہاں ہے؟" امی جان نے سخت خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"کون سا دیو؟ کیا ہو گیا تھا تمہیں؟" ابا بولے۔

"وُہ بیس فٹ لمبا دیو تھا۔ لوہے جیسے سخت ہاتھ تھے اُس کے۔ جن پر یہ بڑے بڑے ناخن تھے۔ اُس نے پیچھے سے آ کر اندھیرے میں ہم دونوں کی گردنیں دبوچ کر وہاں سے اٹھایا اور خوب جھنجوڑ جھنجوڑ کر ہمیں یہاں پھینک دیا۔ پھر اُس نے تیز تیز روشنی پیدا کی اپنی آستین سے، اور ہمارے گلے میں سانپ ڈال کر غائب ہو گیا۔ وہ ..... وہ سانپ کہاں ہیں؟" امی جان نے کہا۔

اُن کا بدن بُری طرح کانپ رہا تھا اور بھائی شاکر صاحب ابھی تک سکتے کے عالم میں پڑے تھے. جیسے ہل ہی نہ سکتے ہوں.

"وُہ.... وہ تو بُرے ہُوتے سانپ تھے بھئی، مگر یہاں کے بھوت تو بڑے پڑھے لکھے اور بہت ہی چالاک ہیں. صاف ستھری اُردُو بولتے ہیں اور بڑے بڑے وزنی پتھر اٹھاکر مار دیتے ہیں. ہم تو بال بچے ہیں." ابّا جان نے کہا. وُہ ایک بار پھر اپنے خوف پر غالب آ چُکے تھے. یہ اُن کی طبیعت کا عجیب خاصا ہے وہ اپنی بے چینی اور اپنے اضطراب پر خود ہی قابو پا لیتے ہیں.

"وُہ آگ کیسی تھی؟" امّی جان نے مُریل سی آواز میں پوچھا.

"بے چارے صابر کا بستر جل گیا ہے. پر یہ میرا بیٹا ہے بڑا بہادر — ذرا نہیں ڈرتا." ابّا جان نے کہا.

"خاک ڈالیں اِس کی بہادری پر. یہ سوچیں کہ وہ آگ کس نے لگائی ہے؟" امّی جان نے کہا.

"مَیں کیا جانوں، اِس کوٹھی میں کیا مُصیبت ہے. میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا." ابّا جان نے کہا.

"ایسی مُصیبت تو ہم نے کبھی دیکھی نہ سُنی. کہتے ہیں وہ سانس بھی لیں تو آگ لگ جاتی ہے. جو جی چاہے وُہ کر سکتے ہیں." امّی جان نے اپنی رائے ظاہر کی.

"ہاں ہاں، وہ چاہیں تو ایٹم بم بھی چلا سکتے ہیں. مجھے تو یہ

کسی آدمی کی بدمعاشی معلوم ہوتی ہے۔" ابا جان بولے۔
"آدمی ہو تو نظر نہ آئے۔ سامنے آ کر مقابلہ نہ کرے۔ وہ ہوائی مخلوق ہے جو اسی طرح چھپ چھپ کر ستایا کرتی ہے۔" امی نے کہا۔
کتنی ہی دیر تک ہم وہاں لان میں گھاس پر بیٹھے رہے یہاں تک کہ صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔ دور کسی مسجد میں مؤذن نے اللہ اکبر کی صدا بلند کی تو امی جان ہڑبڑا کر اٹھیں اور بولیں:
"شاکر کے ابا، پانی لا دیں۔ میں وضو کر کے نماز پڑھ لوں۔ اللہ کا شکر ہے جو ہماری جانیں بچ گئیں۔ سورج نکلتے ہی کسی مکان کا پتا کریں۔ ہم آج ہی یہاں سے نکل جائیں۔"
"ہاں ہاں، میں پانی لاتا ہوں۔ مگر تم سب آؤ۔ اب تو صبح ہو رہی ہے۔" ابا جان نے کہا۔
اور ہم سب سہمے سہمے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے میں جا پہنچے۔ اب کوٹھی میں ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ میرا بستر بری طرح جل چکا تھا۔ دری بھی اور کھیس بھی۔ تکیہ بھی کافی جل چکا تھا اور امی جان کی چارپائی تک آگ اپنا اثر دکھا چکی تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہم نے فوراً پانی ڈال کر آگ بجھا دی تھی؛ ورنہ تو وہ آگ ساری کوٹھی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔
سورج نکلتے ہی ابا جان کسی مکان کی تلاش میں نکل گئے۔ وہ رات کے خوفناک واقعات سے اس قدر پریشان ہو چکے تھے کہ اب

وہ بھی کسی نہ کسی طرح فوراً وہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ ابھی انہیں وہاں سے رُخصت ہوئے آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ ہمیں اپنی سائیکل پر واپس آتے نظر آئے اور آتے ہی بولے:

"بھئی، اپنا سامان باندھ۔ اِسی سڑک پر جو مکان ہیں سیّد کالونی میں۔ وہاں ایک کوارٹر خالی ہے۔ اُس کا پینتیس روپے کرایہ ہے ہم وہاں جا رہے ہیں"

"اللہ تیرا شکر ہے جو ہمیں اِس مُصیبت خانے سے نجات ملے گی" امّی جان نے کہا اور ہم نے کھٹاکھٹ اپنا سامان باندھنا شروع کیا۔ سامان ہی کتنا تھا ہمارے پاس۔ ہم نے آدھ گھنٹے میں ساری چیزیں باندھ کر ریڑھے پر لادیں اور نو بجے کے قریب وہاں سے نکل کر سیّد کالونی کی طرف چلے گئے۔ وہ پینتیس روپے کا کوارٹر ہمارے پہلے کوارٹر سے کہیں زیادہ اچھا تھا۔ ہم شہر سے اگرچہ کافی دُور آ چکے تھے پھر بھی رہنے کے لیے جب اچھی جگہ مل جاتے تو فاصلے بُرے نہیں لگتے۔ اُس کوارٹر میں دو کمرے تھے۔ چھت پر جنگلہ تھا صحن بھی کافی کھُلا تھا۔ پانی، بجلی کا بھی اچھا انتظام تھا۔ صبر شکر کرکے ہم اُس میں آباد ہو گئے اور اُس کوٹھی میں جو کچھ ہم نے دیکھا تھا اُس کے تذکرے کرنے لگے۔

چوتھے روز میرا خالہ زاد بھائی ناصر گجرات سے چھٹیاں گزارنے کے لیے ہمارے پاس آ پہنچا۔ اُس کا سکول یکم جون کو بند ہو گیا تھا۔ اُسے

دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی. کیوں کہ وہ بڑا تیز طرار لڑکا تھا۔ مَیں نے کہا، چلو اچھا ہُوا قبلہ بھائی صاحب جیسے پھسڈی آدمی سے تو نجات ملی۔ اُن کی جلی کٹی سُن سُن کر مَیں عاجز آچکا تھا۔ ناصر کو مَیں نے کوٹھی کے سارے واقعات سُنا دیے تو وہ بولا :

"یار تم اُس کوٹھی سے خواہ مخواہ اُٹھ آئے ہو۔ اتنی سستی تو ملی تھی نہیں۔" وُہ مجھے گھر سے باہر لا کر اُس کوٹھی کی طرف دیکھتے ہُوئے بولا۔ جو وہاں سے دُھندلی سی نظر آتی تھی۔

"خُدا بچائے اُس کوٹھی سے بھائی۔ تم چاہتے ہو کہ ہم سب شہید ہو جاتے وہاں، بڑا بڑا بھُوت اور بڑی بڑی خوف ناک چڑیلیں رہتی ہیں وہاں۔ کوئی اُس کوٹھی میں دو دن بھی نہیں کاٹ سکتا۔" مَیں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہُوئے کہا۔

"تم بھی بڑے بزدل ہو یار۔ بھُوتوں سے ڈرتے ہو۔ وہ آدمی کو کچھ نہیں کہتے۔" وُہ بولا۔

"کچھ نہیں کہتے — ارے وہ اِتنے بڑے بڑے پتھر اُٹھا کر مارتے ہیں کہ آدمی پس کر رہ جائے۔" مَیں نے کہا۔

"مَیں نہیں مانتا یار، آج تک مجھے تو کوئی بھوت نظر نہیں آیا۔" وُہ بولا۔

"آں جناب اگر کوئی بھُوت دیکھ لیں۔ تو سوا مہینہ بے ہوش پڑے رہیں۔ اتنے لمبے لمبے ناخن، اتنے لمبے لمبے دانت اور سیاہ

لمبے لمبے بال ہوتے ہیں بھوتوں کے کہ آدمی خوف سے ہی مَر جاتا ہے۔"
میں نے کہا۔
"کوئی بھوت تم نے دیکھا بھی تھا کہ یُوں ہی وُہائی مچاتے رہتے ہو؟" اُس نے کہا۔
"دیکھنے کی بات کرتے ہو تم ــــ ارے، ہم نے تو اُن کی چوٹیں سہی ہیں۔ میرا بستر جلا دیا اُنہوں نے۔ اتی جان اور شاکر بھائی کی گدی پر اُن کے ناخنوں کے نشان اب تک موجود ہیں۔ کمال کرتے ہو یار، تم سمجھتے ہو ہم احمق ہیں سارے۔" میں نے کہا۔
"تم اگر مجھے ایک بھوت دکھا دو تو میں تمہیں ایک فلم دکھا دوں گا۔" وہ بولا۔
"پیسے ہیں تیرے پاس؟" میں نے بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔ یہ تو اللہ میاں خود ہی ہماری مشکلیں آسان کر رہے تھے۔ کتنا جی چاہتا تھا میرا کہ کوئی فلم دیکھوں۔ مگر اتنے پیسے اپنے پاس کبھی جمع نہ ہو سکے تھے کہ میں یا بھائی صاحب اس قسم کی کوئی چیز دیکھ سکتے۔
"ہاں ہاں، میں اپنی امی سے بیس روپے لے کر آیا تھا۔ کرایہ اُنہوں نے الگ دیا تھا۔" وُہ جیب پر ہاتھ مار کر بولا۔
"بس ٹھیک ہے پھر۔ آج میں آنجناب کو شام کے وقت وہاں لے جا کر بھوت دکھا دوں گا۔" میں نے کہا۔

"یار، شام کو تو خالہ جان شاید باہر نہ نکلنے دیں۔ میرا خیال ہے ہم ابھی چلتے ہیں۔" ناصر نے کہا۔

"تو چلو پھر، شاید اب بھی کوئی بھوت وہاں مل جائے۔ مگر یار کہتے ہیں کہ بھوت رات کو نظر آتے ہیں۔" مَیں نے خیال ظاہر کیا۔

"چلو کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی بھوت صاحب مل گئے تو انہیں سلام کہہ لیں گے؛ ورنہ ٹھنڈے ٹھنڈے واپس آجائیں گے۔" ناصر نے کہا۔

وہ اسی وقت مجھے اپنے ساتھ لے کر اُس کوٹھی کی طرف چل دیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ابھی ہم اُس کوٹھی سے بیس قدم دُور ہی تھے کہ بھائی شاکر صاحب پیچھے سے دوڑتے ہوئے آئے اور ہانپتے ہوئے بولے:

"یہ...... یہ تم دونوں کہاں جا رہے ہو؟"

"ہم ذرا یہ کوٹھی دیکھیں گے۔ صابر کہتا ہے اِس میں بھوت رہتے ہیں!" ناصر نے کہا۔

"چلو، مَیں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہُوں!" یہ کہہ کر وہ ہمارے ساتھ چلنے لگے مگر جب ہم پھاٹک پر پہنچے تو معلوم ہُوا کہ کوٹھی میں کوئی نئے کرایے دار آچکے ہیں۔ یہ بڑی اچنبھا بات تھی۔ ہمیں جو وہاں تلخ تجربہ ہُوا تھا وہ ایسا نہ تھا جسے ہم بھُول سکتے۔ چوکیدار کو آبا نے ساری باتیں بتا دی تھیں۔ پھر یہ کون عقل کا اندھا تھا جس نے وہ کوٹھی کرایے پر لے لی تھی۔ انہیں تو بھوت ایک منٹ وہاں نہ رہنے دیں گے۔

# باب ۴

ہم آہستہ آہستہ پھاٹک میں سے گزر کر کوٹھی کے اندر جا پہنچے۔ دس بج رہے تھے۔ برآمدے سے باہر کھڑے ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں کہ ہال کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک معزز آدمی باہر نکلا۔ وہ ململ کا سفید کرتہ اور سفید پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے پاؤں میں چپل بھی سفید ہی تھے۔ وہ مسکراتا ہوا ہماری طرف بڑھا اور بولا:

"کیا بات ہے بچو، کس لیے آئے ہو؟"

"جی، جی ہم یوں ہی یہ کوٹھی دیکھنے آئے ہیں۔ ہم بھی یہاں کچھ دن رہے ہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اچھا، اچھا، آؤ اندر بیٹھو!" وہ بڑے تپاک سے بولا۔

ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ وہ آگے بڑھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولا:

"آجاؤ بھئی، ڈرتے کیوں ہو تم۔ آؤ شاباش!" یہ کہہ کر اُس نے تینوں کو اپنے ساتھ لیا اور ہال کمرے میں داخل ہو گیا۔ اُس کے پیچھے اندر جا پہنچے۔ اب اُس کمرے کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔

خوب صورت پردے دروازوں پر لٹک رہے تھے۔ فرش کا درمیانی حصہ ہی خالی تھا؛ ورنہ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ صوفے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف کونے میں سنگار میز رکھی تھی۔ جس پر قدِ آدم آئینہ لگا تھا۔ وہ آدمی بولا:

"میرا نام انور ہے۔ مجھے انور حمزہ کہتے ہیں۔ مجھے مکان کی ضرورت تھی۔ کسی نے اِس کوٹھی کا پتا بتایا تو مَیں نے اِسے دیکھا اور فوراً قبضہ کر لیا۔ مجھے شمرو چوکیدار نے بتایا ہے کہ یہاں بھوت رہتے ہیں۔ مجھے تو کسی بھوت نے شکل نہیں دکھائی۔ مجھے اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ تم لوگوں کی کرسیاں بھی غائب ہو گئیں۔ میرا خیال ہے کسی نے تمھارے ساتھ شرارت کی ہے۔"

"جی، ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ ہم تو خوفزدہ ہو کر نکل گئے تھے۔ بڑے عجیب تماشے دیکھے تھے ہم نے۔" مَیں نے کہا۔

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ مجھے تم لوگوں سے بڑی ہمدردی ہے۔ کیوں بھئی کملا جی، کیا خیال ہے تیرا؟" اُس نے بلند آواز سے کہا، جیسے وہ دوسرے کمرے میں کسی سے مخاطب ہو۔

"جی سرکار، کیا فرمایا آپ نے؟" ایک لمبے تڑنگے آدمی نے اُس کمرے میں داخل ہو کر بڑے ادب سے پوچھا۔ اُسے دیکھ کر تو ہم دنگ رہ گئے۔ یہ اونچا لمبا درخت اِتنا قد تھا۔ اُس کا شیر ایسا چوڑا چکلا سینہ، کھلے ہاتھ پاؤں، بھاری بھرکم آواز۔

"بھئی، یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِن کی یہاں سے کُرسیاں غائب ہو گئی تھیں۔ یہی لوگ یہاں سے ڈر کر بھاگے تھے۔" حمزہ صاحب نے کہا۔

اُس آدمی کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ اُبھری۔ اُس نے گہری گہری نظروں سے ہمیں دیکھا اور بولا:

"جی اللہ بہتر جانتا ہے کہ کیا بھید ہے۔ مَیں تو جنّوں بھوتوں سے خود بہت ڈرتا ہوں۔"

"کلاچی، تو خود بھی تو جن ہی نظر آتا ہے۔ تجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔" حمزہ نے کہا۔

"وُہ تو میری شکل ہی ایسی ہے جی تو مَیں کیا کر سکتا ہوں۔" کلاچی یہ کہہ کر واپس مُڑا تو ایک لحظہ کے لیے حمزہ سے اُس کی نظریں ملیں۔ مجھے یُوں لگا جیسے حمزہ آنکھ دبا کر اُسے کچھ سمجھا رہا ہو۔

"ذرا دیکھو تو شاید اِن کی کُرسیاں مل جائیں۔ کیوں کہ اگر کوئی چور آتا تو سارا سامان لے جاتا۔" حمزہ نے کہا۔

کلاچی بولا: "اچھا، دیکھوں گا۔" یہ کہہ کر وُہ باہر نکل گیا۔

کوئی دس منٹ تک حمزہ ہم سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ یہ ہم کیا کرتے ہیں، کہاں پڑھتے ہیں، ہمارے ابّا کیا کرتے ہیں۔ یہ اور اِسی طرح کی اور دوسری باتیں وہ ہم سے پُوچھتا رہا ۔ ۔ ۔

اچانک کلاچی اندر آیا اور بولا: "سرکار، کچھ کرسیاں اُدھر کوارٹر میں پڑی ہیں، وُہ جو نوکر پیشہ کے لیے ہیں۔ مَیں نے تو ابھی دیکھی ہیں۔"

"اچھا، کمال ہے۔ چلو بھئی دیکھتے ہیں وہ کیسی کُرسیاں ہیں؟" حمزہ نے کہا اور ہمیں ساتھ لے کر وہ کوارٹروں کی طرف چل دیا جو کوٹھی کے احاطے میں بنے ہوئے تھے۔

وہاں جا کر جو ہم نے دُوسرے نمبر کے کوارٹر میں نگاہ ڈالی تو ہماری کُرسیاں وہاں دھری تھیں۔ آڑھی ترچھی اُلٹی سیدھی۔

"ارے، یہ تو ہماری ہی کُرسیاں ہیں!" شاکر بھائی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"مگر انہیں یہاں کس نے ڈال دیا ہے؟" مَیں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"اب یہ ساری باتیں تو تُم ہی سمجھ سکتے ہو ہمیں کیا معلوم!" حمزہ نے کہا۔ پھر بولا: "بھئی اٹھاؤ یہ کُرسیاں اور گھر لے جاؤ۔ تُم نے کہیں تھانے میں تو رپورٹ نہیں لکھوائی تھی؟"

"جی نہیں، ہم تو اتنے خوفزدہ تھے کہ کسی سے کُچھ کہہ بھی نہ سکے۔ ہماری جانیں بچ گئیں، ہم نے یہی غنیمت سمجھا!" مَیں نے کہا۔ ہم تینوں نے وہ کُرسیاں اور میز اُٹھائے اور اُسی وقت انہیں لے کر گھر کو چل دیے۔

امّی جان نے جب ہمیں کُرسیوں سمیت گھر آتے دیکھا تو حیران رہ گئیں۔ جب ہم نے سارا قِصّہ انہیں سُنایا تو بولیں:

"خُدا غارت کرے، پتہ نہیں کس مُوئے کو دُشمنی تھی ہم سے۔ اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ وہ کسی آدمی کی شرارت تھی۔ وہ ہمیں

وہاں سے نکال دینا چاہتا تھا۔"

"مگر کیوں امّی جان، ہم نے بھلا کسی کا کیا بگاڑا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ اچھا دفع کرو اِس پر مغز پچی کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولیں۔

ہم نے کرسیاں اندر رکھ دیں۔ مگر دل میں بڑی کھُد بُد ہو رہی تھی کہ آخر وہ کرسیاں کس نے پُر اسرار طریقے سے غائب کیں اور کس طرح وہاں پھینک دیں اور کس شخص نے ہمیں رات بھر اتنا پریشان کیا تھا کہ ہمیں تنگ آکر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ یہ ساری باتیں ایسی تھیں جن کا جواب ہمیں ملنا چاہیے تھا۔ میرا ذہن بُری طرح اُلجھ چکا تھا۔

ہمارے گھر میں اخبار روزانہ آتا تھا۔ ابّا جان اخبار پڑھے بغیر دفتر نہ جاتے تھے۔ میری بھی عادت بن چکی تھی کہ اخبار پڑھے بغیر مجھے چین ہی نہ آتا تھا۔ اگلے دن صبح سویرے میں نے گلی میں سے گزرتے ہوئے ہاکر کو آواز دی۔ اُس سے اخبار لیا اور گھر پہنچ کر اُسے جب کھول کر دیکھا تو سب سے پہلے جس خبر نے مجھے متوجہ کیا وہ تھی ایک خوبرو نوجوان کے قتل کی خبر۔ اُس کی لاش اُس گہری بدرو میں سے ملی تھی جو ہمارے علاقے کے نیچے سے بہتی تھی۔ وہ زیرِ زمین گندے پانی کی ایک بہت پُرانی گزرگاہ تھی جس کے اُوپر بھی مکان بنے ہوئے تھے۔ کوئی دو فرلانگ تک وہ بالکل نظر

نہیں آتی تھی۔ پھر ہمارے مکان سے کافی آگے جاکر وہ نظر آنے لگتی تھی۔ وہاں سے اُس کا پانی کھیتوں میں پہنچتا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ وہ خفیہ پولیس کے کسی نوجوان کی لاش تھی جو کیچڑ میں لت پت ہو رہی تھی۔ وہ تصویر دیکھ کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اِس کے ساتھ ہی ایک اور تصویر تھی جو زندہ حالت میں کھینچی تھی اور اُس تصویر کو دیکھ کر میں بڑے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ میں نے اُس نوجوان کو کہیں ضرور دیکھا ہے اور وہ یاد داشت کچھ ایسی پرانی بھی نہ تھی۔ اُسے تھوڑا ہی عرصہ پہلے میں نے اپنی آبادی میں گھومتے دیکھا تھا۔ وہ لمبا تڑنگا، گورا چٹا جوان تھا جو ہاتھ میں بید کی چھڑی، سر پر طرّے دار پگڑی، گھیردار شلوار اور سفید قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے کپڑے اُس کے بدن پر ایسے جچتے تھے کہ اُسے دیکھ کر دل خوش ہو جاتا تھا۔ یہ میری عادت ہے کہ میں جب بھی کسی خوبرو جوان کو دیکھتا ہوں تو اُسے دیکھتا ہی رہ جاتا ہوں۔ میرا اپنا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ میں بھی اُسی کی طرح جوان اور صحت مند بنوں اور اُس تصویر میں جس نوجوان کو میں زندہ اور مردہ حالت میں دیکھ رہا تھا وہ ایسا نہیں تھا کہ میں اُسے بھول سکتا۔ خیال یہ تھا کہ اُسے چودہ گھنٹے پہلے بے ہوش کر کے کسی نے کیچڑ میں پھینک دیا تھا۔ اُس کی لاش بہتی بہتی دوسری طرف جا نکلی تھی۔

میں صحن میں کھڑا وہ خبر پڑھ رہا تھا اور میرا ذہن بُری طرح اُلجھتا

جا رہا تھا۔ مَیں اِس کوشش میں تھا کہ کسی نہ کسی طرح مجھے یاد آ جائے کہ مَیں نے اُس بد قسمت نوجوان کو کہاں دیکھا تھا۔

جب مَیں نے ذہن پر کچھ زور ڈالا تو مجھے معلوم ہُوا کہ وُہ ایک فقیرنی سے کھڑا تین دِن پہلے اِسی سڑک پر کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دُور دُور تک کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا اور وہ بڑے تلخ لہجے میں اُس فقیرنی سے کچھ پُوچھ رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ وُہ فقیرنی اُسی علاقے میں منڈلاتی پھرتی ہے۔ وُہ ادھیڑ عُمر کی بڑی تیز طرار عورت ہے۔ صبح شام وُہ اپنا پیالہ لے کر دَر دَر مانگنے نِکل جاتی ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ وُہ کہاں رہتی ہے۔ مگر مَیں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہُوں کہ وُہ اُسی علاقے میں پھرتی رہتی ہے۔

مَیں نے اخبار تو ابّا جان کے حوالے کیا اور خود مَیں باہر نِکل گیا۔ کیونکہ مجھے اُمید تھی کہ وُہ فقیرنی اِس وقت کہیں نہ کہیں جگہ مجھے ضرور مِل جائے گی۔ وُہی وقت تھا جب وُہ صبح سویرے بھیک مانگنے نِکلا کرتی تھی۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ کیوں نہ مَیں نے وہاں رُک کر اُس نوجوان اور اُس فقیرنی کی باتیں غور سے سُنیں۔ کیوں کہ مجھے تو اِس میں کوئی گہرا بھید نظر آتا تھا۔ وُہ پولیس کا خوبرُو جوان جس کا نام کاظم تھا خُدا جانے کس سنگدل کے ہاتھوں اِس انجام کو پہنچا تھا۔ میرا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ وُہ فقیرنی اُس کوٹھی سے کچھ زیادہ دُور نہیں

تھی جس سے ہم نکل بھاگے تھے اور جس کا نام ریاض منزل تھا۔ مَیں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا سارے علاقے میں گھوم گیا۔ اپنے مکان کے اردگرد سترہ اٹھارہ مکان تھے جو سیّد کالونی کہلاتے تھے۔ وہ مَیں نے سب کے سب دیکھ لیے مگر وہاں کوئی بھی فقیرنی مجھے نظر نہ آئی۔ مایُوس ہو کر مَیں ریاض منزل کی طرف چل دیا جس کا پہلا نام مایا بھون تھا۔ مگر جب سے وُہ مسلمان کے قبضے میں آئی تھی اُس کا نام ریاض منزل رکھ دیا گیا تھا۔ ہمارے سکول میں بھی چھٹیاں ہو چُکی تھیں۔ اِس لیے اب ہم بالکل آزاد ہو چُکے تھے۔ جب مَیں ریاض منزل کے قریب پہنچا تو مجھے پھٹے ہُوئے میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹی ہُوئی ایک عورت اُس کوٹھی کی دیوار کے ساتھ چلتی نظر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ پھاٹک کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مَیں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا اُس کے قریب سے گزرا۔ ایک نظر مَیں نے اُس کے چہرے پر ڈالی تو میرے بدن میں سنسنی سی دَوڑ گئی۔ وُہ عورت وُہی فقیرنی تھی جسے مَیں نے تین دِن پہلے کلثوم سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔

مَیں نے وہاں رُک کر کوئی بات پُوچھنا مناسب نہ سمجھا اور آگے نکل گیا۔ کوٹھی کی نکڑ پر ایک درخت تھا۔ مَیں دُھوپ سے بچنے کے لیے اُس کے نیچے جا ٹھہرا، کیوں کہ سُورج صُبح ہی صُبح دوزخ کی طرح تپنے لگتا تھا۔ جُون کا مہینہ ہمارے لیے عذاب سے کم نہیں ہوتا۔
وُہ عورت پھاٹک کھول کر بے دھڑک اندر داخل ہو گئی۔ مَیں

دیوار کے اُوپر سے برابر لان میں دیکھ رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی اُس کوٹھی کا لان عبور کرکے برآمدے کی طرف بڑھی۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ وہاں کھڑی ہو کر بھیک مانگے گی اور جو کچھ ملے گا لے کر اُن ہی قدموں واپس آجائے گی ۔۔۔ مگر نہیں، وہ فقیرنی برآمدے میں یُوں داخل ہُوئی جیسے وہ اُس کا اپنا گھر ہو۔ اُس نے بڑی بے فکری سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔

اُس کا یہ رویّہ دیکھ کر میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے ایسی فقیرنیاں تو نہ دیکھی تھیں جو لوگوں کے گھروں میں بے دھڑک گھس جاتی ہوں۔ میں نے سوچا، ضرور یہ وہاں چوری کی نیّت سے اندر گھسی ہے۔ اِسے کسی نہ کسی طرح سے معلوم ہو چکا ہوگا کہ مالک اندر نہیں ہے، مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے وہ کچھ تو دیکھتی کچھ تو سوچتی، دروازہ کھول کر اندر جانے سے پہلے کچھ تو احتیاط سے کام لیتی۔ میں نے کہا نہیں، یہ چوری کی نیّت سے اندر نہیں گئی۔ ہو سکتا ہے یہ اُن لوگوں کی واقف ہو۔ مگر حمزہ صاحب ایسے آدمی تو نہیں کہ وہ ایسی گری پڑی عورتوں کو بے دھڑک اندر آنے دیں۔ میں دیر تک وہاں کھڑا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ عورت باہر نکلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ دو گھنٹے کے انتظار کے بعد میں تھک ہار کر واپس آگیا۔ میں نے سوچا، پھر کسی دن اِسے پکڑوں گا۔

جب میں گھر پہنچا تو ناصر اور شاکر بھائی کاظم کے قتل پر گرما گرم

بحث کر رہے تھے۔ بھائی صاحب بولے :

"یار، وہ بدرو تو مَیں نے بھی دیکھی ہے۔ چلو تمہیں بھی دکھاتا ہُوں۔ شاید وہ لاش ابھی وہیں ہو۔"

"چلو مَیں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہُوں۔" مَیں نے کہا اور ہم تینوں وہاں سے نکلے اور اُس بدرو کی طرف چل دیے جو اُس آبادی میں زیرِ زمین بنی ہُوئی تھی۔ ابا جان دفتر جا چکے تھے۔ اب ہم ہر طرف سے بے فکر ہو کر باہر جا رہے تھے۔ مَیں نے اپنے ساتھیوں سے اُس فقیرنی کا ذکر بالکل ہی نہ کیا۔ مَیں نے کہا کہ شاکر بھائی تو ازل کے سڑی ہیں، بخواہ مخواہ وکیلوں کی طرح جرح کریں گے اور ناصر نیا نیا آیا ہے۔ اُسے ہمارے معاملات کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اس لیے مَیں بالکل چُپ رہا۔

کوئی فرلانگ بھر فاصلہ طے کرنے کے بعد جب ہم اُس جگہ پُہنچے، جہاں سے بدرو کُھلتی تھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں پولیس کے کئی آدمی کھڑے نقشے بنا رہے تھے۔ وہ ہر آدمی کو بڑے غور سے گھُور گھُور کر دیکھ رہے تھے۔ ہم ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے۔ بدرو منہر جتنی گہری تھی اور سارے شہر کا مَیلا اُس میں بہہ کر آتا تھا اور اُسی میں سے کاظم کی لاش مِلی تھی۔ کئی جمعداروں کو پولیس والوں نے اُس بدرو میں اُتار رکھا تھا۔ مگر وہ تھوڑی دُور تک آگے جاتے تھے اور پھر واپس پلٹ آتے تھے کیونکہ آگے اندھیرا تھا اور وہاں گیس بھی

اتنی تھی کہ آدمی سانس نہ لے سکتا تھا۔ اگرچہ اُس گیس کو خارج کرنے کے لیے دو جگہوں پر اُونچی اُونچی چمنیاں بنی تھیں، پھر بھی جتنا علاقہ اُس بدرو نے گھیر رکھا تھا وُہ اِس قدر زیادہ تھا کہ پُوری گیس اُن چمنیوں کے ذریعے باہر نہ نکل سکتی تھی اور پولیس والوں کا خیال تھا کہ کاظم تو اُس گیس ہی میں مَر گیا ہوگا۔ مگر وُہ یہ سوچتے تھے کہ اُسے اِس بدرو میں کِس نے پھینکا۔ وُہ ایسا بچّہ تو نہیں تھا کہ آپ ہی آپ اُس میں اُتر گیا ہو اور پھر گیس سے بے ہوش ہو کر کیچڑ میں گر کر مَر گیا ہو۔ یہ بات اُن کے جی کو نہیں لگتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اِس معمّے کو حل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

کافی دیر تک ہم وہاں کھڑے رہے۔ جب وُہ پولیس کے آدمی اپنی کارروائی مکمل کر کے واپس چلے گئے تو ہم نے بھی نیچے جھانک کر دیکھا تو وُہ ایک لمبی سُرنگ تھی جس کے اندر کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ ہماری تفتیش بھی بے کار ہی ثابت ہوئی۔ تنگ آ کر ہم بھی لَوٹ آئے۔ راستے میں شاکر بھائی بولے:

"اگر مَیں پولیس افسر ہوتا تو اِس آبادی کے سب لوگوں کو قید کر کے پُوچھتا کہ کِس نے کاظم کو قتل کیا ہے؟"

"جی ہاں، جی ہاں، کیوں نہیں۔ خُدا گنجے کو ناخن نہ دے۔ اگر خُدانخواستہ آپ کے ہاتھ میں اختیار آ جائے تو دن دہاڑے لوگ مَرنے لگیں!" مَیں نے کہا۔

"وُہ کس طرح جی، یعنی تمہیں ہماری ہر بات میں نقص کیوں نظر آتا ہے ؟" وُہ چمک کر بولے۔

"بات یہ ہے قبلہ وکعبہ جناب بھائی محمد شا......"

"بکواس بند کرو تم۔ مجھے تمہارے اِس قبلہ وکعبہ سے سخت چڑ ہے۔" وُہ مجھے ڈانٹتے ہُوئے بولے۔

"کیوں بھئی اِتنے تو ادب سے وُہ بُلاتا ہے آپ کو۔" ناصر نے میری حمایت کی۔

"یہ ادب ہے کوئی، لعنت ہے ایسے ادب پر۔ سیدھی طرح یہ مجھے بھائی جان نہیں کہہ سکتا۔" شاکر بھائی نے ناراض ہو کر کہا۔

"بات یہ ہے بھائی جان کہ آپ پولیس افسر بن ہی نہیں سکتے۔"

"کیوں، ہم کیوں نہیں بن سکتے پولیس افسر ؟" وُہ بولے۔

"آپ کی کوئی بھی کل تو سیدھی نہیں ہے آپ کو غصّہ بے پناہ آتا ہے۔ آپ رسّی کو سانپ سمجھ کر ڈرنے لگتے ہیں اور یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ ساری آبادی کو گرفتار کرکے پوچھا کریں گے۔" مَیں نے کہا۔

"تو اِس میں کیا بُرائی ہے ؟" وُہ بولے۔

"اپنے گھر والوں کو بھی پکڑ لیا کریں گے آپ !"

"اُن کا معاملہ ذرا اور ہے۔ بھلا قتل ہوں ہی کیوں ؟" وُہ بولے۔

"بھلا آپ پولیس افسر ہوں ہی کیوں ؟" مَیں نے کہا۔

"اچھا بھاڑ میں جاؤ تم !"

"آپ ذرا یہ بتائیں کہ اِس قتل کا سُراغ لگا سکتے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"لگا کیوں نہیں سکتے ہیں۔ دس بیس سپاہی مل جائیں، ایک ہنٹر مل جائے تو پھر سب سُراغ مل سکتے ہیں۔"

"اللہ آپ سے محفوظ رکھے، سُنا آپ نے ناصر صاحب کیا فرماتے ہیں میرے قبلہ و کعبہ جناب بھائی محمد شا......؟"

"پھر وہی بکواس، صابر میں کہتا ہوں تو باز آئے گا کہ نہیں؟" بھائی صاحب نے مُکّہ تان کر کہا۔

میں سر جھکا کر اُن کے آگے آگے چلنے لگا اور وہ غصّے میں جلتے بُھنتے میرے پیچھے پیچھے آنے لگے۔

اُن دونوں کو گھر چھوڑ کر میں ایک بار پھر اُس کوٹھی کی طرف چل دیا۔ اپنے ساتھ میں نے گیند اور بَلّا بھی لے لیا۔ میں نے سوچا اگر وہ فقیرنی نظر نہ آئی تو گیند اُچھال کر کوٹھی کے لان میں پھینک دُوں گا اور پھر گیند لینے کے بہانے سے میں اندر جا گھسوں گا تاکہ معلوم کر لوں کہ وہ فقیرنی وہاں ہے کہ نہیں۔

پھاٹک کے قریب سے گزر کر میں ایک بار پھر اُس درخت کے نیچے جا ٹھہرا۔ وہاں سے کوٹھی کا برآمدہ صاف نظر آتا تھا۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہیں ہے۔

کافی دیر تک میں وہاں کھڑا رہا۔ مگر کوئی بھی آدمی باہر نہ نکلا۔ میں

نے تنگ آکر بڑے زور سے گیند کو اُچھال کر لان کے اندر پھینک دیا۔ وہ اُچھلتا اُچھلتا برآمدے تک جا پہنچا۔ اُس کے پیچھے ہی مَیں نے بھی چھلانگ لگادی اور بھاگ کر برآمدے تک جا پہنچا۔ مجھے اُن لوگوں نے اندر سے دیکھ لیا۔ کلاچی نے ایک دم دروازہ کھولا اور بڑے رُعب سے بولا :

"یہ کوئی گراؤنڈ سمجھ لی ہے تم نے، گیند کیوں پھینکا ہے یہاں ؟"

"جی بس اُچھل کر اندر آگئی۔ مَیں باہر سڑک پر کھیل رہا تھا!" مَیں نے سہم کر کہا۔

اِتنے میں حمزہ صاحب تولیے سے منہ پونچھتے باہر نکل آئے اور بولے :

"ارے صابر کیا ہے، کیوں ڈانٹتے ہو اسے کلاچی۔ آؤ بھئی اندر آجاؤ۔"

"جی شکریہ۔" مَیں نے کہا اور موقع غنیمت جان کر ہال کمرے میں جا پہنچا۔

کمرے میں خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ سارا ماحول مہک رہا تھا — حمزہ صاحب بھی میرے ساتھ ہی اندر آگئے اور بولے :

"کیا پیو گے بھئی ؟"

"جی شکریہ، مجھے پیاس نہیں ہے۔"

"لیمو لاؤ بھئی کلاچی! اِس کے لیے شربت بناؤ۔" وہ بولے۔

کلاچی نے مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھا اور باہر نکل گیا۔ کوئی دس منٹ بعد وہ جب واپس آیا تو شیشے کا شربت سے بھرا ہُوا جگ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ دو گلاس بھی وہ ساتھ لایا تھا۔

مَیں نے اور حمزہ صاحب نے ایک ایک گلاس پیا اور برتن خالی کرکے میز پر رکھ دیے۔ سامنے دوسری میز پر کیرم بورڈ پڑا تھا۔ مجھے تو اِس کھیل سے اتنا پیار تھا کہ مَیں ابا جان کے ساتھ شام کو پہروں بیٹھا کیرم بورڈ کھیلتا رہتا تھا۔ اگرچہ ہمارا بورڈ بڑا ہی پرانا اور ناہموار تھا پھر بھی مَیں نے اُس کھیل میں بڑی مہارت پیدا کرلی تھی۔

مَیں اُٹھ کر اُس میز تک جا پہنچا۔ حمزہ صاحب بولے :

"تُم کھیلتے ہو کیرم بورڈ ؟"

"جی، کچھ کچھ کھیل لیتا ہُوں!" مَیں نے کہا۔

"اچھا تو لاؤ پھر ہو جائیں تُم سے دو دو ہاتھ!" وُہ بولے اور آستینیں چڑھا کر کُرسی پر آ بیٹھے۔ میز کے سامنے دُوسری کُرسی پر مَیں بیٹھ گیا۔ پہلی بازی مَیں نے دیکھتے ہی دیکھتے جیت لی۔ کلاچی ہمارے قریب ہی بیٹھا غور کر رہا تھا۔

"بھئی بہت اچھا کھیلتے ہو تُم تو، کوئی پیسے ہیں تیرے پاس شرط بد کر کھیلتے ہیں!" حمزہ صاحب نے کہا۔

"جی نہیں، میرے پاس تو کُل چھ آنے ہیں۔ مگر مَیں شرط لگا کر نہیں کھیلوں گا!" مَیں نے گھبرا کر کہا "کیوں کہ جس کھیل میں بھی شرط لگا دیں

وہ جُوا بن جاتا ہے۔"

"چلو چھ ہی آنے ٹھیک ہیں۔ چھ آنے کے بدلے ہم چھ روپے لگائیں گے۔ تم جیتے تو چھ روپے تمہارے۔ ہم جیتے تو چھ آنے ہمارے اور گھبراؤ مت" وہ بولے۔

"جی بہت بہتر۔" مَیں نے خوش ہو کر کہا۔

اب بڑے زور لگنے لگے۔ مجھے یہ دُھن کہ مَیں جیت لُوں اُنہیں یہ خواہش کہ وہ اپنے چھ روپے کسی نہ کسی طرح بچا لیں۔ ایک ایک ہاتھ اُنہوں نے بڑی احتیاط سے مارا جیسے قارون کا خزانہ ہار رہے ہوں۔ مگر اُن کے ہاتھ میں وہ پھرتی نہیں تھی۔ وہ چستی اُن میں غائب تھی جو گوٹ کو ٹھکانے لگانے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ سٹرائیکر بار بار اُن کے ہاتھ کے نیچے سے پھسل جاتا تھا۔ مَیں نے اتنی تیزی سے بورڈ کو صاف کیا کہ وہ ہانپنے لگے۔ اپنی باری پر وہ اِس قدر سوچ سمجھ کر ہاتھ چلاتے جیسے میدانِ جنگ میں کھڑے گولی سے جان بچانے کی فکر میں ہوں۔

سولھویں منٹ پر مَیں نے بورڈ صاف کر دیا۔

"ہم ہار گئے کلاچی، دیکھو صابر نے ہمیں ہرا دیا۔ ہم سے اظہارِ افسوس تو کر لو!" حمزہ صاحب نے کہا اور جیب سے چھ روپے نکال کر اُنہوں نے میرے سامنے رکھ دیے۔

"جی نہیں، یہ روپے آپ رکھ لیں!" مَیں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی یہ تو ہم ہار چکے ہیں۔ چلو ایک بازی اور، تمہارے چھ اور ہمارے چھتیس۔ تم ہارو تو چھ۔ ہم ہاریں تو چھتیس، منظور ــــ؟" وہ مسکرا کر بولے اور اطمینان سے کھیلنے لگے۔ کیرم بورڈ پر پیسے دیکھ کر مَیں ڈر رہا تھا۔ کیوں کہ شرط بد کر کھیلنا تو بہت بُری بات ہے۔

اچانک دروازہ کھلا تو وُہی بُڑھیا دروازے میں نمودار ہوئی جس کا مَیں نے پیچھا کیا تھا۔ وُہ چھوٹتے ہی بولی:

"جناب جی، مَیں جا رہی ہوں ــــ" کچھ اور کہنے کے لیے اُس نے مُنہ کھولا ہی تھا کہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ حمزہ صاحب نے اُسے گھور کر دیکھا اور بولے:

"ساری جگہ صاف کر دی ہے نا تُو نے؟"

"جی صاحب جی" وُہ دبے لہجے میں بولی۔

"شاباش، یہ لو تمہارا انعام" یہ کہہ کر اُنھوں نے پانچ روپیہ کا نوٹ بڑھیا کی طرف بڑھایا، پھر بولے:

"مانگ کر کھانے کی بجائے مزدوری کر کے جینا بہتر ہے مائی، روز آ کر کام کر جایا کرو کچھ نہ کچھ دے ہی دیا کریں گے ہم۔"

"بڑی مہربانی ہے صاحب جی آپ کی" یہ کہہ کر اُس نے پانچ کا نوٹ لیا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ کلاچی آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے کوئی بات سمجھا رہا تھا جس کا مجھے کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ مَیں گوٹ پر جھکا ہوا تھا۔ اچانک جو میری نگاہ اُدھر اُٹھی تو مَیں نے دیکھا کہ

کھاجی معنی خیز انداز سے حمزہ صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ مَیں نے نظریں جُھکا لیں۔ مجھے اُن دونوں سے پہلی بار عجیب طرح کا خوف محسوس ہُوا۔ یُوں لگا جیسے وُہ میرے ہی متعلق آپس میں کوئی اشارے کر رہے ہیں۔ پھر مَیں نے اِس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور کھیل میں محو ہوگیا۔

حمزہ صاحب ایک بار پھر پُورے جوش خروش کے ساتھ کھیلنے لگے۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے ہاتھ چلا رہے تھے۔ کتنی دیر تک وہ بازی پھنسی رہی۔ جب آخری گوٹ ٹھکانے لگی تو پتا چلا کہ کھیل برابر رہا ہے۔

"دوبارہ بھئی، وَنس اگین!" حمزہ صاحب بولے۔ اُن کا لہجہ اتنا پیارا اور صاف سُتھرا تھا کہ جی چاہتا تھا اُن کی باتیں سُنتا رہُوں۔

کھیل دوبارہ شروع ہُوا تو اب کی بار میرا اسکور تیزی سے بڑھنے لگا۔ مجھے یُوں لگتا تھا جیسے حمزہ صاحب جان بُوجھ کر ہاتھ ہلکا رکھ رہے ہیں۔ مگر نہیں، یہ بات مجھے تو نہیں سوچنی چاہیے کیوں کہ اُن کے چھتیس روپوں کا سوال ہے۔ وُہ اِتنے دریا دل کس طرح ہو سکتے ہیں کہ خواہ مخواہ اتنی بڑی رقم میرے ہاتھ پر ہار دیں۔ مگر دو تین ہاتھ جب اِسی طرح چلے تو مَیں نہ رہ سکا۔ مَیں نے کہا:

"آپ دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔"

"تُم نے کیسے سمجھا کہ مَیں دلچسپی نہیں لے رہا ہُوں۔ تُم ہو ہی بہت تیز۔۔۔" وہ چہک کر بولے۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے پُوری شدّومد

سے حملہ شروع کیا اور مجھے کتنی ہی دُور پھینک گئے۔ پھر مجھے بھی سخت جوش آیا اور جوں ہی سٹرائیکر میرے ہتھے چڑھا۔ مَیں نے پے در پے جو حملے کیے تو پھر سٹرائیکر اُن کو جب ہی دیا جب بورڈ پُوری طرح صاف ہوگیا۔

"کلاچی ہم پھر ہار گئے۔ بیڈ لک، بیڈ ڈے یہ لو اپنے تھرٹی سکس صاحب تم جیت گئے بھئی ایک بازی اور — پُوری رقم لگاؤ۔ اب ہم ہارے تو بیالیس ان ٹو بیالیس تمھیں دیں گے، یہ سالی ہماری 'لک' ہی خراب ہے آج۔"

"کیا کرتے ہیں صاب جی، پتا ہے بیالیس ان ٹو بیالیس کتنے بنتے ہیں۔ سترہ سو چونسٹھ روپے۔" کلاچی نے ایک دم کیرم بورڈ پر دونوں ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"ہٹ جاؤ کلاچی، ہم اِس لڑکے سے ہار نہیں مانیں گے۔ وٹ اے ڈے اِز دِس۔" حمزہ صاحب نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔

اُن کی باتیں سُن کر میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی تھی۔ مَیں کبھی ایک آنہ بھی اِس کھیل پر لگا کر نہیں کھیلا تھا اور وہاں سے اب تک بیالیس روپے جیت چُکا تھا۔

پھر چھوڑ دیں بورڈ، رقم آپ لگائیں مَیں کھیلتا ہُوں۔" کلاچی نے کہا۔

"اوہ نو پلیز، یہ کیا حماقت ہے۔ اپنی گن اپنی گولی اپنی

قسمت "۔ یہ کہہ کر حمزہ صاحب ایک بار پھر کھیل میں جُت گئے۔ اب کی بار وہ کچھ اپنے زیادہ جوش میں تھے کہ میری ایک ایک بات پر اعتراض کرنے لگے۔ فاؤل نہ کھیلو۔ یہ غلط ہے وہ غلط ہے۔ ایک بار پھر۔ چانس چانس۔ گڈ گڈ۔ بات بات پر وہ اُچھلتے رہے۔

ابھی بازی درمیان تک نہیں پہنچی تھی کہ کلاچی جیسا ایک اور دیو ہیکل آدمی کمرے میں داخل ہوا اور ہمارے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں ایک بڑی وزنی انگوٹھی تھی۔ ویسی ہی انگوٹھی حمزہ صاحب اور کلاچی نے بھی پہن رکھی تھی اور اُن سب کے ہاتھوں میں ایک ہی طرح کی انگوٹھیاں تھیں جو بائیں ہاتھ کی درمیانی اُنگلیوں پر چڑھی تھیں۔

اُس آدمی نے کوئی بات نہ کی۔ بس خاموشی سے بیٹھ کر ہمارا کھیل دیکھنے لگا۔ اچانک جو میری نگاہ اُوپر اُٹھی تو وہ کلاچی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پُوچھ رہا تھا کہ میں کون ہُوں۔ یعنی یہ نیا چہرہ کہاں سے آیا ہے۔

مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اُن دونوں نے مُنہ دُوسری طرف پھیر لیے۔ پھر اُس آدمی نے بور ہونا شروع کیا۔ اُسے ہمارے کھیل سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اُس نے آہستہ آہستہ اپنی اُس وزنی انگوٹھی کے ساتھ میز کو بجانا شروع کر دیا۔ ٹک ٹک ٹک ٹک۔ وہ یُوں میز کو بجا رہا تھا جیسے کوئی جلترنگ بجا رہا ہو۔ تھوڑی دیر تک وہ

میز کو بجاتا رہا۔ وہ رُکتا تو کلاچی اپنی انگوٹھی سے میز بجانے لگتا وہ دونوں رُکے تو حمزہ صاحب نے میز بجانی شروع کر دی۔ ساتھ کے ساتھ کھیل بھی جاری تھا۔ کوئی پانچ منٹ تک میز بجتی رہی اور پھر اچانک حمزہ صاحب بڑے جوش کے ساتھ اُٹھے اور بولے:

"بھئی صابر، اب ہم اور نہیں کھیلیں گے۔ چلو کلاچی فوراً اُٹھو۔ تم بھی اُٹھو مصدر خان، چلو جلدی کرو؛ ورنہ دیر ہو جائے گی۔ ہمیں بڑے کام کرنے ہیں ابھی۔" یہ کہہ کر حمزہ صاحب اٹھ گئے۔ مَیں نے بیالیس روپے اُن کے سامنے رکھ دیے۔

"یہ آپ رکھ لیں صاحب، مَیں جا رہا ہُوں۔" مَیں نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔

"ارے نہیں بھئی۔ دٹ اِسے فُولش بوائے یُو آر۔ یہ تم نے جیتے ہیں۔ یہ تمہارا حق ہے۔ بازی ہمارے وُشنے رہی۔ کل بارہ بجے پھر آ جاؤ۔ پھر کھیلیں گے ہم۔ شاباش، یہ لے جاؤ بچے۔" اُنھوں نے میرے گال تھپتھپاتے ہُوئے کہا۔

"مگر صاحب، مَیں یہ کس طرح لے لُوں؛ میرا ان پر کوئی حق نہیں ہے۔ مَیں جُوا نہیں کھیلتا ہُوں!"

"اوہ! تو یہ جُوا نہیں ہے، یہ تو کھیل ہے بھئی اور یہ تمہارا انعام ہے اِسے لے جاؤ اور خُوب خرچ کرو۔ شاباش جاؤ۔ کل پھر بازی چلے گی!" وہ بولے۔

اور جلدی جلدی اپنے وارڈ روب کی طرف بڑھے جہاں اُن کے کپڑے ٹنگے تھے۔

مَیں ابھی تک وہاں کھڑا سوچ رہا تھا کہ مصدر خان نے گھُور کر مجھے دیکھا اور بولا:

"تو بچے تم جاتا نہیں اے ایدر سے"

"اوئے مصدر خانا، مت ڈانٹو اِسے امارا دوست اے وُہ۔ تو اُدھر اٹ جاؤ۔ بڑا اچّا کھیلتی یہ۔" حمزہ صاحب نے خالص پشاوری لہجے میں کہا۔

"اچّا بابا لوگ اچّا، یہ بچّہ کا یاری اچّا نہ ہوتی۔" مصدر خان نے پیچھے ہٹتے ہُوئے کہا۔

"جاؤ بھئی صابر میاں شاباش، کل پھر آنا اچّھا" یہ کہہ کر حمزہ نے ہاتھ بڑھا کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ مَیں نے رقم جیب میں ڈالی اور اپنا گیند بلا اُٹھا کر کوٹھی سے باہر نکل آیا۔

# باب ۵

رقم کو جیب میں محسوس کر کے میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اِتنے پیسے میرے پاس آج تک کبھی نہ ہُوئے تھے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ اُن روپوں کو کہاں رکھوں، کس طرح خرچ کروں۔ امّی جان کو دے دوں تو وہ ایسی جرح کریں گی کہ اصل بات چھپانا مشکل ہو جائے گی اور اُنہیں جب پتا چلے گا کہ مَیں نے کیرم بورڈ پر بیٹھ کر رقم حمزہ صاحب سے جیتی ہے تو وہ چپتے مار مار کر میرا حلیہ بگاڑ دیں گی۔ نہیں مجھے اِس رقم کو کل تک چھپا کر رکھنا چاہیے۔ کل میں یہ رقم حمزہ صاحب کو واپس کر دوں گا، ہاں یہی بہتر ہے۔ یہ سوچ کر مَیں مطمئن ہو گیا۔

گھر جا کر مَیں نے چپکے سے وہ نئے نئے نوٹ اپنی اُردو کی کتاب کے اوراق میں چھپا کر رکھ دیئے اور پھر کتاب کو اچھی طرح ڈھانپ کر مَیں نے دُوسری کتابوں کے نیچے رکھ دیا۔ اب مَیں اس طرف سے بالکل مطمئن تھا۔ بھائی صاحب ناصر کے ساتھ بیٹھے کیرم بورڈ پر آڑے ترچھے ہاتھ مار رہے تھے۔ وہ دونوں ہی اناڑی تھے اور بھائی صاحب تو ہر معاملے میں خواہ مخواہ دُلہا بنتے

کی کوشش کرتے تھے۔ اُن سے اچھا تو ناصر کھیل لیتا تھا۔ اگرچہ کیرم بورڈ پر وُہ بالکل نیا تھا۔ مگر بھائی صاحب کے ہاتھ خُدا جانے کیوں ایسے موقعوں پر خواہ مخواہ لرزنے لگتے تھے۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے کوئی مریل طوطا کُرسی پر بیٹھا کیرم بورڈ کا ستیاناس مار رہا ہو۔ مَیں اگر انہیں بتا دیتا کہ قبلہ و کعبہ جناب بھائی محمّد شاکر صاحب، مَیں نے فلاں آدمی سے کیرم بورڈ پر بیالیس روپے جیتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ انہیں غش آجاتا۔ وُہ میرے متعلق کوئی ایسی خبر سُن ہی نہ سکتے تھے۔ مَیں رہ نہ سکا۔ مَیں نے کہا:

"قبلہ و کعبہ جناب بھائی محمّد شا......"

"پھر وُہی بک بک لگا دی ہے تُو نے۔" وُہ ایک دم غضبناک ہو کر بولے۔

"جی میرا مطلب ہے کہ آپ کوئی اور نیک کام نہیں کر سکتے۔ مثلاً گلی ڈنڈا وغیرہ کھیلیں یا بار بار پیٹ پر ہاتھ رکھ کر پاخانے کی طرف دوڑیں لگائیں۔"

"کیوں کیا سمجھتا ہے تُو، مَیں کیرم بورڈ نہیں کھیل سکتا۔ تجھ سے زیادہ تیز ہاتھ ہے میرا — یہ دیکھ میرا سکور — بڑا کھلاڑی بنتا ہے خود۔" وہ تیزی سے بولے۔

"اتنا سکور تو میرے بچے بھی بنا سکتے ہیں۔" مَیں نے منہ پچکا کرکے کہا۔ اُس روز بھائی صاحب مجھے بالکل ننھے مُنّے دکھائی دے

رہے تھے۔

"بچے! یعنی تیرے بچے بھی ہو سکتے ہیں۔ ابھی تو خود تو نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا ہے تو آخر کیا سمجھتا ہے خود کو ہائیں"

"میں تو آپ کا حقیر بھائی سمجھتا ہوں خود کو۔ وہ ذرا تھوڑا سا کام تھا۔ آپ سے اگر غور فرمائیں تو مہربانی ہوگی" میں نے کہا۔

"کام؟ کیسا کام تھا تجھے مجھ سے؟ دیکھ صابر یہ حرکتیں چھوڑ دے! ورنہ میں بُری طرح پیش آؤں گا۔ بتا اب کیا کام ہے تجھے؟"

وہ سخت جھنجلاتے ہوئے لہجے میں بولے۔

"وہ ایک فقیرنی پھرا کرتی ہے نا یہاں، وہ جس کے ماتھے پر ناک کی پھننگ کے عین اوپر ایک زخم کا نشان ہے پور بھر لمبا" میں نے اُن کے قریب سٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، وہ فقیرنی جو اِدھر ہر دُوسرے تیسرے دن آیا کرتی ہے" بھائی صاحب نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔ ایسے موقع پر اُن کے کان گھوڑے کی طرح ایک دم کھڑے ہو جاتے تھے۔ رگیں پھڑکنے لگتی تھیں اور چہرے پر بارہ بجنے لگتے تھے۔

"ہاں ہاں، وُہی فقیرنی۔ آپ کا کوئی اُس سے تعلق وغیرہ تو نہ ہوگا" میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"اوئے، دیکھ اوئے صابر، میں تیرا سر گنجا کر دوں گا" انہوں نے پاؤں سے جوتا نکالتے ہوئے کہا۔

"میری کوئی خالہ لگتی ہے۔ وُہ کوئی رشتے دار ہے میری۔ کمبخت تو بہت بدمعاش ہوتا جارہا ہے"

"نہیں نہیں، یہ بات نہیں بلکہ مَیں ایک بڑی زبردست سکیم سوچ کے آیا ہُوں۔ ہمیں اُن بھُوتوں کا سُراغ لگانا ہے نا" مَیں نے اُنہیں بڑے آرام سے سمجھاتے ہُوئے کہا۔

"ہاں، سُراغ تو لگانا ہی پڑے گا" وُہ ایک دم ٹھنڈے ہو کر بولے اور جُوتا زمین پر رکھ کر پاؤں میں ڈالتے ہُوئے مجھے بڑے غور سے دیکھ کر آنکھیں جھپکنے لگے۔

"ہمیں اُس فقیرنی کے گھر کا پتا کرنا ہے۔ میری شکل سے وُہ واقف ہو چکی ہے۔ مَیں چاہتا ہُوں کہ آپ چُپکے چُپکے اُس کا پیچھا کریں اور اُس کا گھر دیکھیں کہاں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وُہ رہتی کہاں ہے رات کو" مَیں نے کہا۔

"شام کو تو مَیں نے اُسے کہیں نہیں دیکھا۔ مگر تُم اُس کا گھر دیکھ کر کیا کروگے؟" وُہ بولے۔

"بس کوئی ایسی ہی بات ہے جو مَیں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ ہمیں اُس کے گھر کا پتا ضرور کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اُن بھُوتوں کے ساتھ ملی ہُوئی ہے" مَیں نے کہا۔

"کیا مطلب؟ اوئے گھاس تو نہیں کھا گیا تُو، انسان کبھی بھُوتوں کے ساتھ بھی میل جول رکھ سکتے ہیں۔ کیسی باتیں کرتا ہے تُو۔

ناصر میاں ذرا اِس کی عقل کا ماتم تو کر لو" بھائی صاحب نے موقع غنیمت جان کر مجھ پر زبردست حملہ کیا۔

"بس آپ کی انھی باتوں کی وجہ سے تو مَیں کہتا ہُوں کہ میرے قبلہ و کعبہ جناب بھائی محمد......."

"پھر...... پھر تُو نے وہی گردان شروع کر دی۔ لگاؤں جُوتا تیرے سر میں" وہ پاؤں سے جُوتی نکالنے لگے۔ ناصر کا اِس بات پر ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ بولا:

"بھائی صاحب، ذرا سُنیں تو سہی کہ فقیرنی کا پیچھا کرنے کے فائدے کیا کیا ہیں؟"

"فائدے خاک ہوں گے۔ پہلا فائدہ تو یہی ہوگا کہ راتوں کی نیند حرام ہو جائے گی۔ دُوسرا فائدہ یہ کہ خواب میں بھُوت نظر آیا کریں گے اور تیسرا فائدہ یہ کہ پیٹ میں مروڑ اُٹھا کریں گے" مَیں نے کہا۔

"ہاں ہاں، یہ بھی ایک فائدہ ہوتا ہے۔" بھائی صاحب تِلملا کر بولے۔

"یار ناصر، بھائی صاحب تو خواہ مخواہ جلی کٹی سُناتے ہیں۔ بس ابھی تو مجھے اُس کے گھر کا پتا چاہیے۔ پھر میں اگلی بات بتاؤں گا خُدا کی قسم بڑا زبردست مسئلہ ہے جو مَیں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی خود میری سمجھ میں بھی پُوری بات نہیں آئی" مَیں نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے، ہم کل ہی تمھیں اُس کے گھر کا پتا کر دیں

گے!" ناصر نے کہا۔

"ہاں، بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔ اللہ خوش رکھے۔ رزق میں برکت دے۔ آل اولاد کا بھلا کرے!" میں نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"اچھا اچھا، اب تم دال فے مین ہو جاؤ۔ ذرا کھیلنے دو ہمیں، لعنت ہے ایسے باتونی پر۔" بھائی صاحب نے پھر سے کیرم بورڈ پر جُھکتے ہوئے کہا۔

میں کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں جا گھسا اور امی جان سے پوچھے بغیر آپ ہی کھانا پیٹ میں ٹھونس ٹھانس کر پھر باہر نکل گیا۔ امی جان اُس وقت سو رہی تھیں۔ اُنہیں جگا کر میں اُن کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا کیوں کہ ایسے میں وہ سخت جھلّا جایا کرتی ہیں اور پنکھا، چمٹا، اینٹ روڑا جو ہاتھ میں آئے، میری کمر میں مار دیا کرتی ہیں۔ اِس لیے میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اپنی روٹی آپ ہی نکال کر کھا لو اور ان کے غضب سے بچے رہو۔

سہ پہر کے وقت میں باہر کھلے میدان میں گھاس پر گیند بلّا لے کر کھڑا تھا کہ ایک سپاہی اور دو تھانیدار میرے قریب سے گزرے۔ اُن کے پاس کوئی بھاری بھرکم دو صندوق تھے اور ایک گٹھڑی بھی تھی۔ وہ میرے قریب پہنچ کر رُک گئے۔ ایک تھانے دار نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور بولا:

"برخوردار، ادھر آؤ ذرا یہ گٹھڑی واں تک پہنچا دو!" اُس کا لہجہ تھانیداروں ایسا حاکمانہ نہیں تھا۔ مَیں لپک کر آگے بڑھا اور کہا :
"لائیے جی، یہ بھی کوئی بات ہے!" یہ کہہ کر مَیں نے تھانیدار کے ہاتھ سے گٹھڑی لے کر کندھے پر رکھ لی۔ اُس میں کاغذات بندھے تھے۔ اب میں اُن کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ تھانیدار نے راستے میں اپنا پستول نکال کر گولیاں بڑی احتیاط سے بھریں اور پھر پستول بند کر لیا۔

"چوہدری صاحب بڑے اندھیر کی بات ہے۔ کاظم کے قتل کا ابھی تک سُراغ نہ ملے یہ ہمارے لیے بڑا چیلنج ہے!" ایک تھانیدار بولا۔

"مَیں خود حیران ہوں سندھو صاحب، ملزم اسی آبادی میں ہے۔ مگر ہم ابھی تک اُسے پکڑ نہیں سکے۔ بدرو کو بھی ہم پوری طرح کھنگال نہیں سکے۔ وہ کئی مکانوں اور کئی کوٹھیوں کے نیچے سے بہتی ہے!" چوہدری صاحب بولے۔

"مکان بدرو کے اُوپر نہیں بن سکتے۔ پتا نہیں اِس علاقے میں بدرو کے اُوپر چھت کس نے ڈال دی تھی!"

"بھئی یہ بڑی زبردست ٹاؤن شپ سکیم تھی۔ ہندوؤں کے وقتوں میں بڑا زور تھا یہاں، مکانوں کی تعمیر کا۔ اب اِس کی وہ قدر نہیں رہی۔ پتا نہیں، وہ کیا کچھ بنانا چاہتے تھے یہاں!"

بہرحال ہماری ذمہ داری بہت نازک ہے چوہدری صاحب ہمیں

یہاں کے تمام مشتبہ آدمیوں کو پکڑنا ہوگا۔ حیرت تو اس بات کی ہے کہ کاظم کے بوٹوں میں سے جو نوٹ ملے ہیں وہ سب کے سب جعلی ہیں اور اپنے خفیہ روز نامچے میں اُس نے لکھا ہے کہ اگر کراچی میرے ہاتھ آجائے تو پھر جعلی نوٹوں کا معمّہ حل ہو سکتا ہے۔ اُس نے کسی بڑھیا کا بھی ذکر کیا ہے جس کے پیچھے وہ کئی دن سے سرگرداں رہا، مگر اُسے کامیابی نہ ہو سکی۔" سندھو صاحب بولے۔

"کمال ہے، کسی آدمی کا نام کراچی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات میں نے آج ہی سُنی ہے۔ کہاں ہے اُس کی ڈائری؟" چوہدری صاحب بولے۔

"وہ دفتر میں محفوظ ہے۔ کاظم کی سب چیزیں بڑی احتیاط سے رکھی گئی ہیں۔ کیا کڑیل جوان تھا وہ۔ مجھے تو بڑا دُکھ ہُوا ہے اس کی موت پر۔" سندھو صاحب نے کہا۔

وہ یہ باتیں کرتے جا رہے تھے اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جن پر یہ لوگ شک کرتے ہیں۔ پھر سندھو صاحب بولے۔

"آپ کہتے ہیں کہ کراچی کسی آدمی کا نام نہیں ہو سکتا۔ میں نے سکھوں کے نام پشاور سنگھ، پنڈی داس، ہزارہ سنگھ تو عام ہی سُنے تھے۔"

"ہاں اُن لوگوں کی بات اور ہے مگر مسلمان تو ایسی حماقت نہیں کر سکتے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

کافی دیر تک وہ اِس معاملے پر بحث کرتے رہے پھر جب
بدرو نظر آنے لگی تو وہ رُک گئے اور بولے:
"کبیر خان، جا ذرا جمعداروں کو بُلا لا۔ وہ وہاں رہتے ہیں، سامنے کے مکانوں میں۔ اچھا بھئی برخوردار بہت بہت شکریہ، کیا نام ہے تمہارا؟" سندھو صاحب نے کہا۔
"جی میرا نام صابر ہے محمّد صابر۔"
"کہاں رہتے ہو تم؟"
"جی سید کالونی میں، وہاں سامنے کے مکانوں میں رہتا ہوں میں۔"
"اچھا اچھا، شاباش۔ ہم بہت خوش ہوئے ہیں تم سے۔" یہ کہہ کر سندھو صاحب نے میری کمر پر تھپکی دی اور مجھے اُنھوں نے وہاں سے رُخصت کر دیا۔
مَیں گھر تک یہی سوچتا رہا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ بے چارے کاظم کو کس نے موت کے گھاٹ اُتارا ہے۔ کیسے کیسے ظالم لوگ رہتے ہیں اِس دُنیا میں۔
شام تک مَیں اُس فقیرنی کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ مَیں نے سوچا، صبح اُس کو مَیں ضرور دیکھ لوں گا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ یہ سوچ کر مَیں گھر جا پہنچا۔
دُوسرے دن شاکر بھائی اور ناصر صبح ہی صبح اُٹھ کر گیلوں پر

گھومنے لگے۔ مَیں بھی اُن کے پیچھے تھا۔ مجھے یہ پایا تھا کہ مَیں اُن سے کافی فاصلے پر رہوں گا تاکہ بڑھیا میری صُورت نہ دیکھ سکے مگر پتا نہیں اُس روز کیا ہُوا، وُہ بھیک مانگنے نہ آئی۔ مَیں نے سوچا کل اُسے حمزہ صاحب سے پانچ روپے مل گئے تھے۔ اِس لیے اُس نے آج اپنے دھندے سے یہ سمجھ کر ناغہ کر لیا کہ دن تو گزر ہی جائے گا۔ یہ فقیر لوگ ازل کے ہڈ حرام ہوتے ہیں۔ انھیں کھانے کو آرام سے ملنے لگے تو یہ سارا سارا دن بستر پر پڑے اینڈتے رہتے ہیں۔ یہ کام کر کے روٹی کمانا نہیں جانتے۔ انھیں بیٹھ کر کھانے کو مل جائے تو وُہ ہلنا بھی بار سمجھتے ہیں۔

مَیں بڑی شدت سے بارہ بجنے کا منتظر تھا۔ وہ سارا وقت مَیں نے بڑی بے چینی سے گزارا۔ مَیں چاہتا تھا کہ حمزہ صاحب کے پاس جا کر اُس کوٹھی کا بھید معلوم کروں۔ مجھے یقین تھا کہ بھوتوں کے قصے میں ضرور کوئی بھید ہے۔ کوٹھی میں آنے جانے کا بہانہ حمزہ صاحب نے خود ہی مہیا کر دیا تھا، ورنہ مجھے کسی بات کا لالچ ہرگز نہیں تھا۔

جوں ہی پونے بارہ ہوئے مَیں نے چپکے سے بیالیس روپے جیب میں ڈالے اور کسی کو بتائے بغیر بڑی خاموشی کے ساتھ گھر سے کھسک نکلا۔ گلی سے باہر پہنچ کر مَیں نے دوڑ لگا دی اور تیزی سے ریاض منزل تک جا پہنچا۔ پھاٹک کھُلا تھا۔ مَیں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا لان عبور کر کے برآمدے میں جا پہنچا اور اُن کو بتانے کے لیے

کر میں آ پہنچا ہوں۔ خواہ مخواہ زور زور سے کھانسنے لگا۔

"آ جاؤ بھئی صابر میاں، دروازہ کھلا ہے۔" حمزہ صاحب کی آواز مجھے سنائی دی۔ وہ ہال کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا تو انہوں نے مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تم بہت اچھے کھلاڑی ہو صابر میاں، اور کھلاڑیوں کی میں بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ کہو کیا حال ہے؟" وہ سگار کا کش لے کر بولے۔

"جی اللہ کا شکر ہے۔" میں نے دبے لہجے میں کہا۔

"وہ روپے تم نے کیا کیے؟" وہ بولے۔

"جی وہ ساری رقم میرے پاس ہے، یہ دیکھیں۔" میں نے جیب سے نوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے، تم نے کچھ بھی خرچ نہیں کیا۔ یہ تمہارے روپے تھے بھئی۔ تم جیسے چاہتے خرچ کر سکتے تھے۔"

"جی مجھے ضرورت ہی نہ پڑی۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو پھر ہو جائے ایک بازی۔ میرے آدمی ابھی تک نہیں آئے۔ میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔ بس ایک گھنٹہ ہے میرے پاس۔ پھر مجھے ضروری کام سے باہر جانا ہے۔ لو پھر بچھاؤ کیرم بورڈ۔" وہ بولے۔ میں نے دیوار کے ساتھ رکھے کیرم بورڈ کو اٹھا کر میز پر رکھا اور پھر گوٹ بچھا کر میں نے ٹاس کیا۔ وہ انہوں نے جیت لیا۔

"لو بھئی، ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ اب بیالیس کے بدلے میں ہم تمہیں بیالیس ان ٹو بیالیس ہی دیں گے۔ لگا دو یہ رقم یہاں" وہ بولے اور جیب سے نئے نئے کئی ہزار کے نوٹ نکال کر انہوں نے اٹھارہ سو روپیہ الگ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ اُس کے قریب ہی مَیں نے بھی اپنے بیالیس روپے رکھ دیے۔ دِل میں مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ مَیں سوچتا تھا کہ وُہ اپنے جی میں یہی سمجھیں گے کہ مَیں لالچ کر رہا ہُوں۔

"مَیں اِن رُوپوں کے لیے نہیں کھیل رہا ہُوں جناب، کہیں آپ غلط نہ سمجھ بیٹھیں۔" مَیں نے اُنہیں سمجھا دیا۔

"مجھے یقین ہے میاں، یہ تو مَیں اپنے شوق کی خاطر ایسا کر رہا ہُوں۔ تمہارے متعلق مجھے معلوم ہے، تُم بہت اچھے لڑکے ہو۔"

"آپ کو میرے ساتھ روپے نہیں بدنے چاہئیں۔ یہ بڑی بُری بات ہے۔"

"ارے نہیں بھئی، میری ایسی کوئی نیت نہیں ہے۔ بس مَیں صرف ایک ہی بازی کھیلوں گا۔ اگر تُم جیت گئے تو پھر بس کر دوں گا۔" وُہ بولے۔

بازی شروع ہُوئی۔ سٹرائیکر اُن کے ہاتھ میں تھا کہ وُہ ٹاس جیت گئے تھے۔ پہلی ہی ضرب میں اُنہوں نے بورڈ پر قیامت مچادی۔ مَیں تو ایک دم گھبرا گیا، کیوں کہ وُہ فیصلہ کُن بازی تھی۔ اپنی باری کا مجھے کتنی ہی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ تین ہاتھ وُہ کھیلے مگر خُوب کھیلے۔ مَیں تو سمجھا مَیں وہیں ہار گیا ہُوں۔

جب شرائیکر میرے ہاتھ میں آیا تو پھر مجھے محسوس ہوا کہ سوائے اُس بازی کے دُنیا میں میرے آگے پیچھے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک دو تین، چار، پانچ، چھ ہاتھ مَیں نے کھیل کیا اور بازی اختتام کو پہنچ رہی تھی اُن کی تین گوٹیں ابھی باہر تھیں اور میری ایک — اور وُہ سخت تذبذب میں تھے۔ وُہ بھی سوچ رہے تھے کہ رقم ہاتھ سے جا رہی ہے۔ وہ ایک گوٹ نیچے ڈال کر چوک گئے۔ پھر میری باری آئی اور مَیں نے سکور پُورا کر دیا۔ اب بورڈ بالکل صاف تھا۔ میری صرف ایک گوٹ باہر تھی۔ عین اُس وقت کمرے میں کلاچی آدھمکا۔ وُہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اور اُس کے پیچھے ایک اور کالا بجنگ آدمی تھا جو سفید سُوٹ پہنے ہُوئے تھا اور سر پر اُس نے سر سکندر مارکہ پگڑی باندھی ہُوئی تھی جس کا طرّہ آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی، بڑی بڑی خوفناک مُونچھیں، سفید ٹائی اور سفید براق بے داغ کوٹ پتلون ڈاٹ کر وُہ صاحب سیدھے اندر آئے اور تیزی سے ہاتھ بڑھا کر بولے:

"مس... مِس مس، سلام لیکم!" یہ کہہ کر اُس نے حمزہ صاحب سے بڑے تپاک کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ہمارے قریب ہی کُرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ کلاچی بڑی گہری گہری قہر آلود نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا ایک بات پر مجھے بڑی حیرانی تھی کہ اُس شخص نے بھی ویسی ہی انگوٹھی پہن رکھی تھی جیسی کلاچی اور حمزہ صاحب کے ہاتھ میں تھی اُس پر بھی ویسا ہی سُرخ رنگ کا نگ تھا جو [illegible] نظر آتا تھا۔ یُوں

لگتا تھا جیسے وُہ ایک ہی دُکان سے بنی ہُوئی انگوٹھیاں پہنتے تھے۔

"کیا حال ہے چوہان صاحب؟" حمزہ صاحب بولے۔

"کرپا، آں شُکر ہے خُدا کا شکر ہے۔" چوہان صاحب نے بڑے ہی کھُردرے لہجے میں کہا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ کرپا سے اُن کی کیا مُراد تھی اور وُہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ اُن کے دانت بہت ہی اُجلے اُجلے اور سفید تھے اور جب وُہ ہنستے تھے تو یُوں لگتا تھا جیسے توے پر کسی نے سفیدی کا داغ لگا دیا ہو۔ ایسا کالا آدمی مَیں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

"دیکھیں جناب گوٹ جا رہی ہے۔" مَیں نے حمزہ صاحب کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا اور واقعی گوٹ غڑاپ سے پاکٹ میں جا گری۔

"تم جیت گئے ہو دوست، اُٹھاؤ یہ رقم۔ تمہارے کھیل کی مَیں داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اِن سے ملیے چوہان صاحب، یہ ہمارے کیرم بورڈ کے کھلاڑی ہیں صابر میاں — یار یہاں مَیں تنہائی سے تنگ آ چکا تھا۔ مَیں نے کہا چلو اس لڑکے سے کیرم بورڈ ہی چلے گا۔"

کلاچی نے ایک بار پھر ترنگ میں آ کر میز پر انگوٹھی بجانا شروع کی۔ پھر چوہان صاحب نے بھی میز کے نیچے ہاتھ کر کے انگوٹھی بجائی پھر حمزہ صاحب کو بھی جوش آیا اور وہ بھی عجیب سے معنی خیز انداز سے انگوٹھی سے میز بجانے لگے۔ اب وُہ تینوں برابر ٹھہر ٹھہر کر ٹک ٹک کر رہے تھے جیسے وُہ سب کے سب موسیقی کے ماہر ہوں اور اپنے

اپنے اندازے ساز بجا رہے ہوں ۔ اچانک حمزہ صاحب کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اُن کی آنکھیں شعلے اُگلنے لگیں۔ وُہ بڑے زور زور سے انگوٹھی کو میز پر مارنے لگے۔ اسی اندازسے چوہان صاحب بھی اب جوش میں آچکے تھے اور کلاچی کا تو یہ حال تھا جیسے وہ مرنے مارنے پر تلا ہو۔ یا اللہ! یہ انہیں ساز بجاتے بجاتے اچانک کیا ہوگیا ہے۔ مَیں تو اُن کے وہ خون آلود تیور دیکھ کر سخت وحشت زدہ ہُوا اور وُہ روپے بھُول کر وہاں سے اُٹھ کر باہر آنے لگا۔ اِس پر حمزہ صاحب نے مجھے روکا اور بولے:

"بچے، اُٹھا یہ رقم اور لے جا۔ مگر مَیں نے جو وعدہ کیا تھا کہ آج کے بعد ہم رقم لگا کر نہیں کھیلیں گے' وُہ پُورا ہوگا تاکہ کہیں تیری عادت خراب نہ ہو جائے۔ بہرحال تُو آیا کر۔ مَیں کل بارہ بجے تیرا انتظار کروں گا۔ شاباش، جا میرا بیٹا۔" یہ کہہ کر اُنہوں نے وُہ اٹھارہ سَو بیالیس روپے اُٹھا کر میری جیب میں ڈال دیے اور مَیں وہاں سے رُخصت ہوکر اُسی وقت گھر کی طرف بھاگا۔

ناصر اور شاکر بھائی گھر پر موجود نہیں تھے۔ امّی جان باہر صحن میں نلکے کے قریب بیٹھ کر کپڑے دھو رہی تھیں۔ میں سیدھا اندر گیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ وُہ نوٹ سارے کے سارے اپنی کتابوں کے نیچے کاغذ میں لپیٹ کر کچھ اِس طرح رکھنے کہ جب تک میری ساری کتابیں نہ اُٹھائی جائیں یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ

وہاں کیا رکھا ہے۔
میں نے اپنے دل میں اُس رات طرح طرح کے منصوبے سوچے، میں نے کہا۔ بھئی صابر اللہ نے تیرے صبر کا اچھا پھل دیا ہے تجھے، گھر بیٹھے بٹھائے تجھے دو ہزار روپیہ مل گیا ہے۔ اب تو جس طرح سے چاہے عیش کرے پٹھے۔ اب کوئی تیرا ہاتھ نہیں روک سکتا۔ ایک سائیکل کی حسرت تھی دل میں کہ کسی طرح پوری ہی نہ ہو پاتی تھی۔ میں نے سوچا یہ سوا دو سو تو اب خرچ ہُوا ہی سمجھو۔ پھر اللہ نے دیا ہے تو ہم ایک اچھا سا ٹرانسسٹر بھی لے لیں گے۔ ایک صبح شام ریڈیو سُن کر خوش ہوتی ہے۔ ہمیں وُہ بھی نصیب نہ تھا۔ اب وُہ حسرت بھی نکل جائے گی۔ پھر میں نے سوچا اور کیا کچھ خریدوں ان روپوں سے۔ پھر مجھے شاکر بھائی کا خیال آیا۔ میں نے کہا۔ چلو ایک سائیکل انہیں نری کو بھی لے دو۔ اگرچہ ہماری ہر بات میں مین میخ نکالتا ہے مگر ہے تو اپنا بڑا بھائی، اچھا شریف آدمی ہے بے چارا۔ ذرا سا بزرگی کا رُعب جماتا ہے، پر چلو اُسے اپنی سی کرنے دو۔ ہمارا کیا ہے ہم جونیئر ہی اچھے۔ ڈھائی سو پر یہ بھی پانی پھر کر رہے گا۔ پھر میں نے کہا کہ ابا جان کے پاس ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں، امی جان کے پاس پہننے کو اچھے کپڑے نہیں۔ زیور نام کا اُن کے پاس ایک چھلا بھی نہیں ہے۔ میں نے سوچا چل بھائی صابر اُن کو بھی ہزار روپیہ اس کام کے لیے دیدیجے پھر اللہ مالک ہے۔ یہ ساری باتیں سوچ کر میں سو گیا۔

# باب ۶

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم تینوں بھائی اُس فقیرنی کی تلاش میں چل دیے۔ دِل میں مَیں نے کہا آج تو اُس بڑھیا کا گھر دیکھ کر ہی رہیں گے وُہ ضرور اُن بھُتوں سے ملی ہُوئی ہے! ورنہ حمزہ صاحب سے اُسے کیا کام۔ وُہ ویسے ہی دریا دل آدمی ہیں۔ اُنھوں نے اُٹھا کر کھٹ سے اُسے پانچ کا نوٹ تھما دیا! ورنہ مَیں ہوتا تو جُوتے بھی مارتا اور کوٹھی سے دھکّے دے کر باہر بھی نکلوا دیتا۔ شکل سے تو وُہ بالکل چڑیل نظر آتی ہے۔ مجھے حمزہ صاحب کی یہ بات بالکل پسند نہ آئی تھی۔ مانا کہ وُہ امیر آدمی ہیں۔ بہُت ہی امیر اور روپیہ اُن کے ہاتھ کا مَیل ہے مگر ایسی بھی کیا دریا دلی کہ ایسے ایسوں کو اُٹھا کر روپے دان کر رہے ہیں۔

شاکر بھائی منہ اُٹھا اُٹھا کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کا یُوں دیکھنا بھی غضب تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا پولیس افسر گشت پر نکلا ہُوا ہے۔ آنجناب پتلون میں ہاتھ ڈال کر سیٹیاں بجا بجا کر دائیں بائیں دیکھتے جا رہے تھے اور ہم پیادوں کی طرح اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ وُہ نہیں دیکھتے تھے کہ اُن کی راہ میں نالی ہے، روڑا ہے، اینٹ ہے، پتھر ہے، کیا چیز ہے۔ بس اپنی دھن میں بڑھے چلے جا

رہے تھے ۔ اچانک اُن کا پاؤں جو زمین میں دھنسی ہوئی آدھی اینٹ سے ٹکرایا تو بھائی صاحب مُنہ کے بل گر پڑے ۔ وہیں دھپ کی آواز پیدا ہُوئی ۔ مَیں نے کہا ۔

"بسم اللہ قبلہ بھائی صاحب ذرا دیکھ کر چلیں ۔ یہ خُدا کی زمین ہے کوئی آپ کی خیالی دُنیا نہیں ہے" یہ کہہ کر مَیں نے جلدی سے انہیں اُوپر اُٹھایا تو یہ انکشاف ہُوا کہ آنجناب کی کافی چیزیں مرمّت طلب ہو چکی ہیں ۔ ماتھے سے خون رسنے لگا تھا ۔ نچلا ہونٹ بھی زخمی ہو چکا تھا اور ناک بھی ذرا چپٹی ہو گئی تھی ۔ قمیص کا تو خیر ستیاناس ہی ہو چکا تھا ۔ کیوں کہ سامنے وُہ کیچڑ میں گرے تھے ۔ پتلون بھی گھٹنے پر سے پھٹ گئی تھی ۔ ایسے عالمِ بے خبری میں گرے تھے بیچارے' کہ مجھے بڑا ہی ترس آیا ۔ مَیں نے کہا ۔

"اب واپس ہی تشریف لے چلیں کیوں کہ اِس حُلیے میں تو آپ اُس مائی کو قطعاً اچھے نہ لگیں گے ۔" مَیں نے کہا ۔

"تو کوئی مَیں اُس مائی کو اچھا لگنے کے لیے تمہارے ساتھ جا رہا تھا' بدتمیز کہیں کے ۔۔ ایک تو مجھے اتنی چوٹیں آ گئی ہیں اور اِدھر سے تمہیں مذاق سُوجھتا ہے ہائیں !" وُہ ایک دم غضب ناک ہو کر بولے ۔ مَیں نے کہا :

"میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا ۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے ۔ اگر آپ کے ہاتھ پتلون میں نہ ہوتے تو شاید ناک مُنہ ہی بچ جاتے ۔

"خیر کوئی بات نہیں گرتے ہیں شہسوار......" میں نے انہیں پیچھے موڑتے ہوئے کہا۔ مگر اُنھوں نے مجھے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ بولے:

"زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ دفع ہو جاؤ تم۔ اب میں خود ہی واپس چلا جاؤں گا۔"

"آپ شدید زخمی ہیں قبلہ اور آپ کو ایسی حالت میں چھوڑ کر بھلا ایک بھائی کس طرح جا سکتا ہے؟" میں نے اُن کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"تو میرا بھائی نہیں ہے، میرا دشمن ہے۔ ہٹ جا چھوڑ دے مجھے، ہر وقت تجھے مذاق ہی سُوجھتا رہتا ہے۔"

"نہیں نہیں، یہ بات نہیں ہے میرے قبلہ و کعبہ جناب بھائی محمد....." میں نے اُن کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے کہا۔

پھر۔پھر۔پھر تم نے وُہی بجواس کی۔ دیکھا ناصر تم تے۔ یہ انسان نہیں بن سکتا۔" وُہ جھلّا کر بولے اور میرے ہاتھوں سے نکل کر الگ چلنے لگے۔

"لائیے میں آپ کا یہ ماتھا تو پُونچھ دوں، کوئی دیکھے گا تو کہے گا شاید پٹ کر آئے ہیں۔" میں نے رُومال نکال کر اُن کا ماتھا پُونچھتے ہوئے کہا۔ اب وُہ کچھ سرد ہو چکے تھے۔ خاموشی سے مُنہ صاف کرواتے رہے اور ساتھ گھر کی طرف بھی چلتے رہے۔

جب ہم دروازے میں داخل ہُوئے تو اَمّی جان نے اپنے لختِ جگر اوّل کی یہ حالت دیکھی تو دل تھام کر آگے بڑھیں۔ بھائی جان کر

صاحب کے واری صدقے جانے کے بعد بولیں:
"کیا ہُوا میرے لال کو، کِس نے مارا ہے بیٹے تجھے، اُسے ڈھائی گھڑی کی آئے۔"
"مارا نہیں ہے اِنہیں کسی نے امّی جان، یہ بے چارے زمین سے ٹکرا گئے ہیں۔" مَیں نے ایک طرف ہو کر کہا۔
"کیا مطلب؟ کوئی زمین سے بھی ٹکرایا ہے کبھی؟" امّی جان نے حیران ہو کر پُوچھا۔
"اِسے سمجھالیں امّی جان، یہ ہر وقت میرا مذاق اُڑاتا رہتا ہے؛ حالاں کہ مَیں اِس سے بڑا ہُوں۔ اِسے تمیز سکھالیں؛ ورنہ بُری طرح پیش آؤں گا۔"
"آئے ہائے، یہ تم دونوں کی لڑائی کبھی مٹے گی بھی کہ نہیں۔ کیا ہُوا تھا ناصر بیٹے؟" امّی نے کہا۔
"جی شاکر بھائی ٹھوکر کھا کر گر پڑے تھے مُنہ کے بل۔ بڑی چوٹیں آئی ہیں اِنہیں۔" ناصر نے کہا۔
"ارے تو سیدھی طرح کیوں نہیں پھُوٹتا کہ گر پڑا تھا شاکر۔ اے ہائے، اِس صابر نے تو چھالے ڈال دیے ہیں میرے۔" امّی جان نے سخت برافروختہ ہو کر کہا۔
"واہ، مَیں نے کیا کہا ہے امّی جان، اِن کو تسلّیاں اور دلاسے اور تسلیاں دلاتے دلاتے تھک گیا ہُوں۔ زخمی یہ ہو گئے اور دیکھیں

رنگ پیلا ہو رہا ہے ، نبض میری سست ہو گئی ہے ۔ آپ تو خواہ مخواہ ہی ناراض ہو رہی ہیں ۔" میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا ۔

"ہاں ہاں ، بڑی ہمدردی ہے تجھے مجھ سے ، ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا تو میرے غم میں ۔ پتہ ہے امّی جان کیا کہتا تھا ، کوئی دیکھے گا تو کہے گا حضرت صاحب پٹ کر آئے ہیں ، لائیے آپ کا منہ پونچھ دوں آپ شدید زخمی ہیں ۔ یہ خدا کی زمین ہے کوئی آپ کی خیالی دنیا نہیں ہے ۔" بھائی صاحب نے میری عین مین نقل اتارتے ہوئے کہا ۔

"لعنت بھیج اس کی صورت پر ، یہ کہاں سے دشمن آگیا تیرا بھولا سا ناسمجھ بیٹا ہے میرا ، یہ صابر تو ہے ہی مشٹنڈا ۔ اللہ بچے اس سے ۔ تو دل کو نہ لگایا کر بیٹے ۔ وہ ویسے ہی تجھ سے مذاق کرتا ہے ۔" امّی جان نے کہا ۔

"کیوں بھائی صاحب چلیں گے آپ اب کہ نہیں ۔" میں نے پوچھا اب کوئی کب تک اُن کی گلی سڑی باتیں سن سکتا تھا ۔

"نہیں نہیں ، میری توبہ ۔ اب میں کبھی تمہارے ساتھ باہر نہیں جاؤں گا ۔" بھائی صاحب نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ۔

"چل یار ناصر ، ان کا تو خواہ مخواہ پارہ چڑھا رہتا ہے ۔" میں نے ناصر کو اٹھاتے ہوئے کہا ۔

"ٹھہر جا بیٹے ، تیرا پارہ تو میں آج تیرے باپ سے اُتروا دوں گی ۔ وہی تیری چابی رکھتے ہیں اپنے پاس ۔ تو بڑے بھائی کو مذاق کرتا

ہے۔ تیرے ٹکڑے ٹھنڈے کرواؤں گی آج "امی جان نے مجھے پکار کر کہا۔ تب میں اور ناصر گلی میں پہنچ چکے تھے۔

"چل یار وہ جھٹنی خدا جانے کہاں ہوگی اِس وقت بھائی صاحب بے چارے خواہ مخواہ زخمی ہوگئے۔" میں نے کہا۔

"بھئی زیادہ نہ ستایا کر اُسے۔" ناصر نے کہا۔

"تیرے سامنے کیا ستاتا ہوں اُسے یار، تو بھی اب کمال کرنے لگا ہے۔" میں نے چمک کر کہا۔

"تیرا بڑا بھائی ہے آخر۔ اُس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔" وہ بولا۔

"لحاظ نہیں کرتا ہوں، اتنے ادب سے بلاتا ہوں اُسے۔ پتہ ہے کیا کرتا ہے وہ، اچھی سے اچھی کاپی خود لے آتا ہے کہ موٹی موٹی ڈیڑھ ڈیڑھ روپے والی اور مجھے پانچ آنے والی پر ٹرخاتا ہے ___ امی جان سے کہتا ہے اِس کے لیے یہی بہتر ہے۔ خود باٹا کے بوٹ خریدے گا۔ میرے لیے کہے گا جی بس وہ کینوس کے شو ٹھیک رہیں گے۔ کھلاڑی لڑکوں کے وہی بہتر ہیں۔ ان سردیوں میں خود آنجناب نے نئی گرم پتلون سلوالی مگر میرے لیے یہ کہا کہ لنڈے سے لادیں اِسے۔ روز تو پھاڑ لیتا ہے یہ کپڑے۔ یہ حال ہے ان بزرگ صاحب کا۔" میں نے جل کر کہا۔

"اچھا کمال ہے یار، بڑے چالاک ہیں شاکر صاحب!" ناصر نے حیران ہو کر کہا۔

"ارے، اور تو اور چھپکے ہی چپکے ہانڈی میں سے بوٹیاں نکال کر کھا جاتے ہیں اور نام میرا لگا دیتے ہیں کہ صابر کھا گیا ہے۔ ابا جان دو درجن کیلے لائے۔ حضرت صاحب نے چھ کیلے اڑنچھو کر لیے اور کہہ دیا کہ قسم اللہ کی مجھے تو پتا بھی نہیں صابر سے پوچھ لیں۔" میں نے ناصر کی آنکھیں اچھی طرح کھولیں۔ شاکر بھائی سے مجھے کوئی ضد تو نہیں تھی۔ اُن کی باتیں ہی ایسی تھیں جن پر مجھے ذرا دل لگی سُوجھتی تھی۔

"حد کر دیتے ہیں یہ تو۔" ناصر پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولا۔

"جب ہی تو میرا جی جلتا ہے اُن کی حرکتیں دیکھ کر۔ پھر میں مذاق بھی نہ کروں، کوئی سوتیلا تو نہیں ہوں میں۔" میں نے اپنے پھپھولے پھوڑتے ہوئے کہا۔

"چل دفع کر یار، تو پھر بھی مزے میں ہے۔ پڑھائی میں بھی اُس سے تو آگے نکل چکا ہے۔" ناصر بولا۔ میں نے دل میں کہا۔ یوں مرو نا تم بھی۔ چلے تھے شاکر بھائی کی ہمدردی کو۔ انھوں نے جو اندھیر مچا رکھا ہے وہ کسی کی بھی نظر میں نہیں آتا۔ آجا کر ایک صابر ہی رہ گیا کمزور آسامی، جو آتا ہے صابر کو ہی لتاڑتا ہے۔

تب میں ہلکا پھلکا ہو کر ناصر کے ساتھ اُس بڑھیا کی تلاش میں نکلا۔ اب میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ شاکر بھائی کی میں بڑی عزت کرتا تھا۔ یوں ہی ذرا اُن سے میری نوک جھونک شروع رہتی تھی؛

ورنہ میرے دل میں بڑی مُحبت تھی اُن کے لیے۔ مگر وُہ خواہ مخواہ ہی ناراض ہوتے رہتے تھے مجھ سے، اور وُہ جو چھوٹی موٹی بے ایمانیاں کرتے رہتے تھے تو اُس پر بھی مجھے کوئی ایسا شکوہ نہیں تھا اُن سے، مگر وُہ کبھی کبھی بہت ہی غضبناک ہو جاتے تھے جیسے مَیں اُن کا کچھ بھی نہیں ہُوں۔

ہم نے دو تین گلیاں دیکھ ڈالیں مگر وُہ بُڑھیا کہیں نظر نہ آئی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہم ریاض منزل کے ارد گرد ایک چکر لگا کر دوسری طرف جا رہے تھے کہ اچانک ہمیں شاکر بھائی نظر آئے۔ وُہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہُوئے آبادی میں داخل ہو رہے تھے۔ ہم دونوں بھاگ کر اُن کے قریب پہنچے تو وُہ بولے :

"اوئے صابر، مَیں نے اُس بُڑھیا کو ابھی ابھی ادھر جاتے دیکھا ہے وہ اُس کوٹھی سے نکلی تھی۔"

"اچھا تو چلیں پھر ہم اُس کا پیچھا کریں گے۔ آپ آگے آگے رہیں۔" مَیں نے کہا۔ اُن کے ماتھے پر امّی جان نے سُرخ سُرخ دوا لگا دی تھی اور وہ کپڑے بدل کر اُسی وقت ہی شاید گھر سے باہر نکل گئے تھے۔ وُہ بھی اب اِس معاملے میں گہری دِلچسپی لینے لگے تھے اور میرے ہم خیال ہوتے جا رہے تھے۔

جب ہم ٹوُن روڈ پر پہنچے تو اچانک وہ بُڑھیا ہمیں دائیں طرف ایک گلی میں گھستی نظر آئی۔ ہم نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ وُہ گلی

میں سے نکل کر دُوسری سڑک پر جا پہنچی اور وہاں سے وہ سڑک عبور کرکے بس سٹاپ پر جا ٹھہری۔

"ارے، یہ تو شاید بس میں بیٹھے گی" مَیں نے کہا۔

"تو پھر کیا ہے چلو ہم بھی بس میں بیٹھتے ہیں" بھائی صاحب بولے اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر وُہ بس سٹاپ کی طرف بڑھے۔ بڑھیا نے یوں ہی ایک اچٹتی سی نظر ہم پر ڈالی اور پھر دُوسری طرف دیکھنے لگی۔ اِتنے میں بس آگئی اور وہ تیزی سے زنانہ دروازے میں داخل ہوگئی۔ پچھلے دروازے کی راہ سے ہم بھی بس میں سوار ہو گئے۔

بس کئی مختلف راستوں سے چکّر کاٹ کر جب ڈیوس روڈ پر پہنچی تو ہم نے دیکھا کہ بڑھیا اُتر رہی ہے۔ اُس روز اُس نے صاف سُتھرے کپڑے پہن رکھے تھے اور وُہ فقیرنی نہیں لگتی تھی۔ ہم بھی اُس کے پیچھے اُتر گئے۔ بس سے اُتر کر ہم ایک دُوسرے کے درمیان فاصلہ رکھ کر اُس کا تعاقب کرنے لگے۔ اچانک اُس نے رُک کر ہمیں بڑے غور سے دیکھا اور پھر سڑک عبُور کرکے دُوسرے کنارے پر چلنے لگی۔ اُس کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے ہمارا وُہ تعاقب سمجھ میں آچکا تھا اور وُہ سخت اُلجھن میں تھی۔

کوئی دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرکے وُہ کچی آبادی میں اُتر گئی۔ اب شاکر بھائی اُس کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے اور اُس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک مکان کے دروازے پر پہنچ کر اچانک

وہ بڑھیا رُک گئی اور شاکر بھائی کو گالیاں دینے لگی۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اُس کے سر پر جا پہنچے۔ وہ بولی :

" حرام خورو، تم کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو۔ کیا چُرا لائی ہوں میں تمہارا ؟"

" کچھ نہیں خالہ جی، ہم تو یُوں ہی اِدھر چلے آئے ہیں " شاکر بھائی نے پریشان ہو کر کہا۔ اُن سے کوئی بھی جواب نہ بن پڑتا تھا۔

" تم بکواس کرتے ہو۔ مَیں اندھی نہیں ہوں۔ میری بھی دو آنکھیں ہیں۔ تم ماڈل ٹاؤن سے میرے پیچھے لگے ہو۔ میرا لڑکا گھر میں ہوتا تو تمہارا تالو گنجا کر دیتا۔ کس لیے آئے ہو تم یہاں ؟" وہ بڑے غصّے سے بولی۔

گلی بالکل سنسان پڑی تھی۔ لوگ سب اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔ مگر کئی مکانوں کے دروازوں میں سے عورتیں جھانک رہی تھیں۔ مَیں نے سوچا کہیں کوئی جھگڑا ہی نہ کھڑا ہو جائے اِس لیے مَیں بڑے آرام سے اُس بڑھیا کے سامنے جا ٹھہرا اور کہا :

" خالہ جی ہمیں آپ سے ایک بات پُوچھنی ہے۔ چلیں اندر چل کر ہم آپ کو بتاتے ہیں " مَیں نے سوچا تھا کہ جس مقصد کے لیے ہم اُس کے پیچھے آئے ہیں۔ وہ اب ظاہر ہی کر دیں تو اچھا ہے۔

" کیا پُوچھنا ہے تم نے مجھے۔ مَیں کوئی چور ہوں کسی کی۔ آؤ اندر دیکھتی ہوں تم کیا بیچتے ہو۔ وہ دروازہ کھول کر بولی۔

اُس کا مکان اگرچہ کچا تھا مگر بہت ہی صاف سُتھرا تھا۔ صحن میں ایک تنکا نظر نہ آتا تھا۔ اُس مکان کے دو کمرے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر بڑھیا نے ہمیں کہا۔

"آؤ اندر بیٹھ کر بتاؤ کیا کہتے ہو تم؟" وہ بڑے غصے میں تھی۔ اور ہمیں کسی طرح بھی دم نہ لینے دیتی تھی۔ کمرے میں ایک صاف سُتھرا پلنگ تھا جس پر سفید چادر بچھی تھی۔ ایک پرچھتی سی بنی تھی جس پر اُس نے بڑے قرینے سے برتن سجا رکھے تھے۔ اُس کے ساتھ ہی ایک بڑا سا صندوق رکھا تھا جس کے اُوپر چھوٹے چھوٹے دو ٹرنک رکھے تھے۔ دیوار کے ساتھ تین کرسیاں تھیں۔ ہم اُن پر بیٹھ گئے۔ وہ گھر کسی طرح بھی فقیرنی کا گھر معلوم نہ ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اچھی خاصی کھاتی پیتی عورت ہو۔

"خالہ جی، مَیں نے آپ کو کچھ دن پہلے ادھر اپنی آبادی میں ایک لمبے تڑنگے آدمی سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ آپ کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا کر رہا تھا۔ اُس آدمی کو جانتی ہیں آپ؟" مَیں نے اپنے طور پر یہ بات بہت سوچ سمجھ کر کہی۔ اِس پر اُس بڑھیا کا چہرہ ذرا دیر کے لیے عجیب طرح سے بگڑا مگر وہ فوراً ہی سنبھل کر بولی:

"مجھے تو یاد نہیں تُو کس دن کی اور کس آدمی کی بات کرتا ہے۔ میرے ساتھ تو روز ہی لوگ جھگڑتے ہیں۔ مَیں اُن سے پیسے جو

مانگتی ہُوں " وُہ پلنگ پر بیٹھ کر بولی۔

" یہ بات نہیں ہے خالہ جی، ہم یہ پُوچھتے ہیں کہ اُس نے آپ کو کوئی نوٹ خیرات میں دیا تھا ؟" مَیں نے پُوچھا۔ میری یہ بات سُن کر وُہ ایک دم آپے سے باہر ہوگئی اور بولی :

" دفع ہو جاؤ یہاں سے ! ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ تمھیں گولی لگے کس ڈھٹائی سے تم یہ باتیں پُوچھتے ہو۔ مَیں کوئی چور ہُوں کسی کی۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے چلو " یہ کہہ کر وُہ ایک دم پلنگ سے اُٹھی اور شاکر بھائی کو بازو سے پکڑ کر باہر دھکیلنے لگی۔ ہم تینوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ وہاں سے فوراً باہر نکل آئیں کیوں کہ خدا معلوم وُہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتی " چلیں بھائی صاحب یہ مائی تو خواہ مخواہ گرم ہوتی ہے۔ پولیس اسے پکڑے گی تو خود ہی یہ سب کچھ بتا دے گی "

" تیرا بیڑہ غرق کس کی پولیس، کیسی پولیس ؟ میں نے کوئی ڈاکہ ڈالا ہے تیرے گھر، جا دفع ہو جا کلموہے۔ جھاڑو پھرے تیری صورت پر۔ تُو یہاں آیا ہی کیوں ہے ؟" یہ کہہ کر اُس نے تڑاخ سے ایک تھپڑ میرے مُنہ پر دے مارا۔ اب مَیں حیران تھا کہ کیا کروں۔ اچانک ناصر نے اُسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا اور ہم تینوں اُسے گالیاں دیتے ہُوئے باہر نکل آئے۔ وُہ بھی ہمیں بڑی زوردار گالیاں دیتی ہُوئی آئی اور صحن کا دروازہ اُس نے دھڑام سے بند کر لیا۔

"یار، بہت بری ہوئی ہمارے ساتھ تو۔ یہ بڑھیا تو بڑی آفت کی پڑیا ہے۔" ناصر نے کہا۔

"پتا نہیں، صابر کو کیا سُوجھی ہے جو اس کے گھر تک لے آیا ہے ہمیں۔ اِس کے سب کام اِسی طرح کے اُلٹے سُلٹے ہوتے ہیں۔ خواہ مخواہ بے عزتی کروائی۔" بھائی صاحب نے جھنجلا کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے قبلہ بھائی صاحب، مجھے تو یہ مائی بڑی پُراسرار نظر آتی ہے۔ یہ اُس کوٹھی میں بھی جایا کرتی ہے۔ ابھی آپ نے اسے وہاں سے نکلتے دیکھا تھا۔"

"دیکھا تو تھا۔ مگر اِس سے کیا ہوتا ہے۔ بے چاری محنت مزدوری کرتی پھرتی ہے۔ پتا نہیں کس طرح گزر بسر ہوتی ہے اس کی۔" بھائی صاحب نے کہا۔

"خدا کرے آپ کا خیال صحیح ہو۔ مگر مَیں جو کچھ دیکھ چکا ہوں اس کی بنا پر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ مائی بے گناہ نہیں ہے۔ مگر ابھی مَیں کچھ نہیں کہوں گا۔ شاید اُن بھوتوں کا اور اُس کا ظم کا اِس مائی سے کوئی تعلق معلوم ہو جائے۔"

"بھوتوں کا؟ یعنی یہ مائی بھوتوں سے بھی ساز باز رکھتی ہے۔" بھائی صاحب بولے۔

"یہی تو مَیں کہہ رہا ہوں۔ شاید دو ایک دن تک مجھے کچھ معلوم ہو سکے۔ کیوں کہ مَیں نے اُس کوٹھی میں ایک شخص سے دوستی کر لی ہے۔"

"کس آدمی سے ؟ وہ جو نئے کرایے دار آئے ہیں وہاں اُن سے ؟"
بھائی صاحب نے پُوچھا۔

"بس ایک صاحب ہیں وہاں، میں اُن سے پُوچھوں گا کہ یہ مائی
کس قسم کی عورت ہے ؟" میں نے کہا۔

"تم کچھ چھپا رہے ہو صابر" بھائی صاحب نے مجھے غور سے
دیکھتے ہُوئے کہا۔

"نہیں جناب قبلہ و کعبہ بھائی محمّد شاکر صاحب، یہ بات نہیں
ہے۔" میں نے نہایت عاجزانہ طریقے سے کہا۔

"دیکھ صابر، تُو نے میرے نام کو اتنا لمبا کر دیا ہے کہ تیرا بھی
سانس پھُول جاتا ہے۔ تُو مجھے شاکر ہی کہہ لیا کر۔" وہ جھنجھلا کر بولے۔

"توبہ، توبہ۔ میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتا بھائی صاحب۔ چلیں
اب بس میں بیٹھ جائیں۔" میں نے کہا۔ سامنے سے بس آ رہی تھی۔ وہ
اُدھر ہی جا رہی تھی جہاں ہم رہتے تھے۔ اُس میں سوار ہو کر تھوڑی ہی
دیر بعد ہم گھر جا پہنچے۔

ٹھیک بارہ بجے میں پھر گھر سے نکلا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا
ریاض منزل کے پھاٹک تک جا پہنچا۔ پھاٹک اندر سے بند نہیں تھا۔
جب میں لان میں پہنچا تو برآمدے میں مجھے کلاچی کرسی پر بیٹھا نظر آیا
وہ موچنے کے ساتھ اپنی ناک میں سے بال اُکھاڑ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے
ہی وہ اُٹھا اور بولا :

"آؤ بھئی آؤ — اندر بیٹھو آؤ" یہ کہہ کر وہ اُٹھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کمرے میں لے گیا۔ حمزہ صاحب وہاں موجود نہیں تھے۔

"حمزہ صاحب کہاں ہیں؟" مَیں نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا۔ کیونکہ کلارچی کو دیکھ کر میرا دل آپ ہی آپ سہم جاتا تھا۔

"وُہ بھی آتے ہیں، ابھی آجائیں گے وُہ۔ ذرا باہر گئے ہُوئے ہیں بس اب آتے ہی ہوں گے۔ بیٹھو، کیا پیو گے تم؟" وہ میرے پاس کرسی ڈال کر بیٹھتے ہُوئے بولا۔

مَیں ابھی تک کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا لیا اور بولا:

"کمال ہے یار، حمزہ صاحب تیرے کھیل کی بڑی تعریف کرتے تھے کہ بہت ہی عمدہ کھیلتے ہو۔ ولایت میں بھی ایسے کھلاڑی نہیں ملتے۔" اُس کی یہ بات سُن کر مَیں بہت خُوش ہُوا کہ کم از کم اُس نے اعتراف تو کیا کہ مَیں اچھا کھیلتا ہُوں! ورنہ وُہ تو ہمیں کھیلتے دیکھ کر جل بھن جاتا تھا۔

"جی بس کھیل ہی لیتا ہُوں کچھ کچھ۔" مَیں نے اپنی خُوشی دباتے ہُوئے کہا۔

"کچھ کچھ؟ کمال ہے یار تم نے کتنے روپے جیتے ہیں اُن سے؟" وُہ بولا۔

"جی مَیں نے کل سترہ سو چونسٹھ روپے اور پرسوں چالیس روپے

جیتے تھے مگر اُنھوں نے پورے دو ہزار روپے مجھے دے دیے ؟
"بڑے مہربان ہیں حمزہ صاحب تم پر ۔ خوش قسمت ہو بھئی ؛ ورنہ وہ تو کسی کے ہاتھ پر ایک پیسہ نہیں رکھتے ۔ تم نے وُہ روپے کیا کیے ؟" وُہ بولا ۔
"جی مَیں نے وہ سنبھال کر رکھ لیے ہیں ۔" مَیں نے کہا ۔
"اچھا خرچ نہیں کیے تم نے ؟"
"جی نہیں ۔"
"اپنے ابّا امّی کو بھی نہیں بتایا ؟"
"جی نہیں ۔"
"کیوں ؟"
"وُہ خواہ مخواہ شک کرتے کہ کہیں سے چُرا لایا ہُوں یا کیا بات ہے ۔" مَیں نے کہا ۔
"اچھا تو پھر کیا کرو گے تم اب ، اُسے کس طرح خرچ کرو گے ؟" وُہ بولا ۔
"جی بس رکھتے رہیں گے وہ پیسے میرے پاس ۔ جب میں کالج میں جاؤں گا تو جب وہ روپیہ خرچ کروں گا ۔" مَیں نے بے ساختہ کہا ۔
"اچھا ، مگر تم اُن روپوں کو رکھتے کہاں ہو ؟ میرا مطلب ہے گھر میں تو وُہ کبھی نہ کبھی کسی کے ہاتھ لگ جائیں گے ۔" وُہ بولا ۔
"جی نہیں ، مَیں نے وُہ روپے اپنی کتابوں کی الماری میں چھپا کر

کتابوں کے نیچے رکھے ہیں!" مَیں نے کہا۔

"کتابوں کے نیچے رکھے ہیں! تم وہ روپیہ بنک میں کیوں نہیں رکھ دیتے؟" وہ بولا۔

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا، مَیں کل ان کو بنک میں رکھ آؤں گا!" مَیں نے خوش ہو کر کہا۔ یہ تجویز ابھی تک میرے ذہن میں نہ آئی تھی۔

"تو پھر تم وہ روپیہ ابھی لے آؤ۔ مَیں تمہارے ساتھ چل کر اُسے بنک میں جمع کروا دوں گا۔" کلاچی نے کہا۔ جُوں ہی اُس نے یہ بات کہی، مَیں فوراً سمجھ گیا کہ وہ آئے بہانے مجھ سے وہ رقم اینٹھنا چاہتا ہے ابھی مَیں کوئی جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ فیلٹ ہیٹ سر پر جمائے بڑا خوب صُورت سا سُرمئی سُوٹ پہنے حمزہ صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور چھوٹتے ہی بولے:

"کیا حال ہے بیٹے، ٹھیک ہو؟ یہ کلاچی صاحب تمہیں کیا پٹی پڑھا رہے ہیں؟"

"جی کچھ نہیں، کہتے ہیں کہ میں وہ دو ہزار روپے لے آؤں تو یہ بنک میں جمع کروا دیں گے!" مَیں نے کہا۔

"کیوں بھئی کلاچی، بڑا استاد ہے تُو۔ تجھے ہماری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ اب تُو نئے حربوں پر اُتر آیا ہے!" اس پر کلاچی نے اپنی انگوٹھی بڑے معنی خیز انداز سے میز پر بجائی۔ اُس کے جواب میں حمزہ صاحب بھی کُرسی کے بازو کو اپنے ہاتھ سے یُوں تھپتھپانے

لگے جیسے اُس کی ٹک ٹک کا ٹک ٹک سے جواب دے رہے ہوں۔ کچھ دیر تک وہ یوُں ہی ایک دُوسرے کو گھورتے رہے۔ بڑی خاموشی سے اپنی اپنی انگوٹھیوں کے ساتھ ٹک ٹک کرتے رہے۔ پھر اچانک حمزہ صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے اور بولے :

"جا بیٹے، تُو وہ رقم لے آ۔ کلاچی صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ اُسے ہم بنک میں رکھوا دیں گے۔ بے فکر ہو کر لے آ وہ روپے۔"

"جی آپ کہتے ہیں تو میں ابھی لے آتا ہُوں۔" مَیں نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔

"ہاں ہاں، جاؤ ابھی لے آؤ۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔" حمزہ صاحب بولے۔ اُن کی یہ بات سُن کر مَیں اُسی وقت وہاں سے اُٹھا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا گھر جا پہنچا۔ امی جان باورچی خانے میں تھیں اور شاکر بھائی ناصر کے ساتھ کیرم بورڈ کھیل رہے تھے۔ مَیں نے اپنی الماری میں سے وہ رقم نکال کر نیفے میں اڑسی اور اُن ہی قدموں واپس ریاض منزل جا پہنچا۔ حمزہ صاحب کپڑے بدل کر آرام کرسی پر لیٹے ہُوئے تھے اور کلاچی اُن کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اُچھل پڑا۔

"لے آئے ہو بھئی، لاؤ دکھاؤ وہ نوٹ کہاں ہیں!" حمزہ صاحب نے کہا۔

مَیں نے نیفے میں سے نکال کر وہ سارے نوٹ اُن کے ہاتھ میں

لے دیے۔

"اِدھر آ کلاچی ذرا!" حمزہ صاحب نے دروازے کی طرف بڑھتے ہُوئے کہا۔ اور کلاچی فوراً اُٹھ کر اُن کے پیچھے چل دیا۔ وُہ دونوں جب باہر برآمدے میں چلے گئے تو مَیں حیران پریشان سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وُہ کیا کر رہے ہیں۔ ایک بات تو مجھ پر ثابت ہو چکی تھی کہ اُنھوں نے بینک کا خواہ مخواہ بہانہ کیا تھا۔ وُہ کسی اور مقصد کے لیے مجھ سے رقم واپس منگوا رہے تھے۔ ہو سکتا ہے حمزہ صاحب کی نیّت بدل گئی ہو اور وہ چاہتے ہوں کہ رقم کسی بہانے مجھ سے واپس لے لیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ بہت ہی کمینہ پن ہو گا اُن کا۔ مَیں اُنھیں بلا چون و چرا رقم تو دے دوں گا، مگر پھر میں کبھی اُن کی صُورت بھی نہ دیکھوں گا۔ اگر ایسے ہی تو چھلے کے آدمی ہیں وُہ تو کس برتے پر اُنھوں نے پہلے وُہ رقم مجھے دے دی تھی۔ کتنی بلند آوازے کہتے تھے۔ جا صابر بیٹے! اُٹھا لے یہ رقم۔ وُہ مجھے خُوش کرنے کے لیے ایسا کر رہے تھے۔ اگر وہ رقم واپس ہی لینا تھی تو پہلے دی ہی کیوں تھی مجھے — ابھی مَیں اسی اُدھیڑ بُن میں ہی تھا کہ وہ دونوں ہنستے ہُوئے واپس آ گئے۔ وُہ نوکروں کے کوارٹر تک ہو کر واپس آئے تھے۔ مَیں نے کھڑکی میں سے اُنھیں لال بلُور کرکے کوٹھی کے پچھلے حصّے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وُہ کمرے میں واپس آ گئے تو حمزہ صاحب نے وُہ نوٹ جُوں کے تُوں میری

طرف بڑھائے اور بولے :

"لے بھتیجی صابر، سنبھال اپنی رقم — اب تو ایک بجنے میں دس منٹ رہ گئے ہیں اور آج ہفتہ ہے۔ بنک ساڑھے گیارہ بجے بند ہو جاتے ہیں۔ پرسوں یہ رقم جمع کروا دینا وہاں جا کر۔"

"جی اگر آپ کو افسوس ہے کہ رقم ضائع ہوئی تو اسے آپ ہی رکھ لیں۔" مَیں نے مُنہ بسورتے ہُوئے کہا۔ اِس پر وہ ایک دم کرسی کے سامنے بیٹھ کر میرے گال تھپتھپانے لگے۔ اور بولے :

"ارے تم ناراض ہو گئے ہو ہم سے۔ نہیں بیٹے ہمارے دل میں تو ایسی کوئی بات نہیں آئی۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہمیں افسوس ہے۔ ہم ہار گئے تو بس ہار گئے۔ اوئے کلاچی، دیکھا تُو نے ہمارے بیٹے کو ناراض کر دیا ہم سے۔ آپ ہی رکھتا پھرتا یہ پیسے جہاں چاہتا۔ تجھے بنک کی کیوں سُوجھی۔" حمزہ صاحب نے کلاچی کو ڈانٹتے ہُوئے کہا۔

"او جی اِسے تو خواہ مخواہ وہم ہو گیا ہے۔ مَیں تو اِس کا ہی بھلا چاہتا تھا۔" کلاچی بولا۔

"خوش خوش رہا کرو صابر میاں اور روز آیا کرو یہاں۔ اب تو دوپہر ہو گئی ہے۔ سونا چاہو تو دُوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔ اب مَیں بھی ذرا آرام کروں گا۔ بہت تھک گیا ہُوں آج۔" حمزہ صاحب بولے۔

"جی شکریہ، اب مَیں چلتا ہُوں۔" یہ کہہ کر مَیں اُٹھا تو وہ بولے :

"اچھا تو کب آؤ گے، تم کل بارہ بجے آ جاؤ۔"

"جی بہت اچھا' مَیں کل پھر آؤں گا بارہ بجے۔ اچھا خدا حافظ" یہ کہہ کر مَیں وہاں سے باہر نکل آیا۔ کوٹھی سے کافی دُور آ کر مَیں نے نوٹ گنے تو وُہ بالکل پُورے تھے۔ مَیں حیران ہُوا کہ اُنھوں نے وُہ نوٹ کِس بیے واپس منگوائے تھے۔ اُنہیں پہلے معلوم نہ تھا کہ آج بنک ساڑھے گیارہ بجے بند ہو گئے تھے۔ مجھے تو اِس معاملے میں کوئی گہرا بھید نظر آتا تھا اور مَیں سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے آدمی ہیں جن کے پاس اتنا ڈھیر سارا روپیہ ہے کہ وُہ ذرا ذرا سی بات پر بے دریغ لُٹا دیتے ہیں۔ مَیں سوچ سوچ کر تھک گیا۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بس اتنی سی بات صاف نظر آتی تھی کہ حمزہ صاحب بہت ہی اچھے آدمی ہیں اور مجھ سے اپنے بیٹے ایسا سلُوک کرتے ہیں اور کلاچی جو ہے نا وُہ سخت گھنّا اور گھن چکّر آدمی معلوم ہوتا ہے۔ شکل سے ہی چور لگتا ہے مگر اُسے حمزہ صاحب نے کیوں اپنے پاس ٹھہرا رکھا ہے اور اب وُہ بھُوت اُنہیں کیوں تنگ نہیں کرتے۔ وُہ تو بڑے آرام سے رہ رہے ہیں وہاں۔ اُن کو تو کوئی بھُوت نظر نہیں آتا۔ نہ دِن کو نہ رات کو۔ یہ کیا قِصّہ ہے۔ بھُوت بھی کوئی آدمی ہیں تمیز کرتے ہیں۔ وُہ تو سب سے ایک سا سلُوک کرتے ہوں گے۔ اُن میں ایسی کیا بات ہے کہ بھُوت اُنہیں بالکل کچھ نہیں کہتے۔ کیا وُہ اُن کی دولت دیکھ کر ڈر گئے ہیں یا یہ لوگ خیرات زیادہ کرتے ہیں یا ہم سے زیادہ نیک اور خدا پرست ہیں۔ نماز روزے کے پابند ہیں

یا کوئی ولی اللہ ہیں۔ آخر ایسی کیا بات ہے ان میں کہ انہیں بھوتوں
نے کچھ نہیں کہا۔ ہم نے اُن کا کیا گناہ کیا تھا بھلا۔ یہ تو خدا کا نام
تک نہیں لیتے۔ ہر وقت روپے پیسے اور عیش و آرام کی باتیں سوچتے
ہیں۔ بے دریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں اور ہم تو اس کوٹھی میں صبح شام
خدا کا ذکر کرتے تھے۔ پانچ وقت نمازیں پڑھتے تھے۔ پھر بھوتوں نے
ہمارا جینا کیوں حرام کر دیا تھا اور ان سے اُنھوں نے کس طرح صُلح
کر رکھی تھی۔ یہ ایسے سوال تھے جن کا جواب مجھے نہیں ملتا تھا۔

# باب ۸

اگلے دن صبح ہی صبح گلی میں اخبار کا ہاکر شور مچاتا ہوا گزرا۔ "پڑھیے پڑھیے صرافہ بازار میں دو لاکھ کا فراڈ — ٹھگوں نے جعلی نوٹ دے کر سونا خرید لیا۔ پڑھیے، آج کی تازہ خبر —" میں نے لپک کر اُس سے اخبار لیا اور وہیں کھڑے کھڑے اُس خبر کی تفصیل پڑھنا شروع کر دی۔ لکھا تھا کہ کل سہ پہر کے بعد ایک ٹھگ نے دو لاکھ روپے کے جعلی نوٹ دے کر صرافہ بازار کے ایک صراف شیر علی سے دو ہزار تولے سونا خرید لیا۔ نوٹ اتنی مہارت سے چھاپے گئے ہیں کہ اصل اور نقل میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ پولیس جگہ جگہ اُس ٹھگ کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہے۔ اُس کا حلیہ یہ ہے لمبی داڑھی، ناک چپٹی، سیاہ رنگ، دائیں گال پر کان کے قریب گہرے زخم کا نشان، سامنے سے چار نچلے دانت ٹوٹے ہوئے، قد چھ فٹ، جسم بھاری بھرکم، آواز باریک، وہ نیلے رنگ کا سمر سوٹ پہنے ہوئے ہے۔ نشاندہی کرنے والے کو پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔

ایسی سنسنی خیز خبروں سے مجھے بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ میں نے بار بار اُس خبر کو پڑھا اور وہ حلیہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ میں نے

کیا ہو سکتا ہے کہ مَیں اُس آدمی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں اور اگر اللہ چاہے تو انعام کی رقم مَیں ہی حاصل کر لوں۔ مَیں نے اخبار لے جا کر ابّا جان کو دے دیا۔ اُنھوں نے جلدی جلدی سُرخیاں پڑھیں اور بولے:

"بھئی، کیا زمانہ آ لگا ہے۔ دو مہینے پہلے بھی ایسے ہی جعلی نوٹوں کے فراڈ کی خبر کراچی سے ملی تھی۔ وہاں تو ٹھگوں نے دس لاکھ رُپے کا سونا خریدا تھا۔"

"اچھا دس لاکھ روپے کا؟ کمال ہے ابّا جی پولیس نے وہ ٹھگ پکڑ لیا ہو گا؟" مَیں نے کہا۔

"ارے نہیں بیٹے، ایسے لوگ خدا جانے کہاں چلے جاتے ہیں۔ وُہ تو فوراً ہوائی جہاز میں بیٹھ کر دُوسرے ملکوں میں پہنچ جاتے ہوں گے۔ اتنا بڑا فراڈ کوئی ایک آدمی تو نہیں کر سکتا۔ پُورے پُورے گروہ ہوتے ہیں اِس کام میں۔" ابّا جان نے کہا۔

"اچھا، پھر تو بہت محتاط رہنا چاہیے صرّافوں کو۔" مَیں نے کہا۔

"محتاط تو ہوتے ہیں وُہ مگر پھر آدمی کی عقل ہی تو ہے کبھی کام کرتی ہے کبھی نہیں کرتی۔ کراچی کے سیٹھ نے تو مجرم کا سُراغ لگانے والے کے لیے تیس ہزار رُپے کا انعام مقرر کر رکھا ہے۔" ابّا جان بولے۔

"اچھا، ہو سکتا ہے کوئی یہ انعام لے بھی چکا ہو۔" مَیں نے کہا۔

"نہیں بھئی، جس آدمی کو اُن کا سُراغ ملتا ہو گا۔ اُس سے جان

چھڑانے کے لیے وُہ لوگ اُسے تیس ہزار کی بجائے ساٹھ ہزار روپے کر اُس کا مُنہ بند کر دیتے ہوں گے! بڑے امیر ہوتے ہیں ایسے لوگ۔ حرام کا مال تو اُنھی کو ہی پچتا ہے۔" ابّا نے کہا۔

یہ کہہ کر وہ سائیکل لے کر باہر نکل گئے۔

میرے ذہن میں ایک دم اُس مائی کا خیال اُبھرا۔ میں نے کہا کہ وُہ نوٹ جو کاظم کی جیب سے نکلے شاید اُس مائی سے برآمد ہوئے ہوں۔ وُہ آدمی خدا جانے کب سے اُس بڑھیا کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب بات کسی نتیجہ خیز مرحلے میں پہنچی ہوگی تو مائی نے اپنے ساتھیوں سے کہہ کر اُسے مروا دیا ہوگا، مگر وُہ کراچی کون ہے اور کاظم نے اُس کا نام کہاں سے سُنا تھا۔ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں آتی تھیں۔ مگر میں کسی سے مشورہ بھی نہ کر سکتا تھا۔ کوئی پولیس والا بھی میرا دوست نہیں تھا اور دوست ہوتا بھی تو وُہ بھلا ایسی باتیں مجھے کیوں بتاتا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں وُہ نوٹ تو جعلی نہیں ہیں جو مجھے حمزہ صاحب نے دیے تھے۔ اب کس طرح معلوم ہو سکے گا کہ وُہ نوٹ اصلی ہیں کہ نقلی — اور اگر وُہ نقلی ہوئے تو جس آدمی کو میں وُہ نوٹ دُوں گا وُہ مجھے فوراً پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دے گا۔ یہ بڑی ہی خوفناک بات تھی۔ پھر میں نے سوچا، نہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں کہہ دُوں گا کہ وُہ نوٹ مجھے حمزہ صاحب نے دیے تھے۔ اب

بس یہ ٹھیک رہے گا۔ مگر معلوم تو کرنا چاہیے کہ وہ نوٹ جعلی ہیں یا اصلی — یہ سوچ کر میں اپنی الماری کی طرف بڑھا اور وہاں سے میں نے بیالیس روپوں میں سے دس روپے کا نوٹ نکالا۔ ریزگاری میں دو ہی نوٹ تھے؛ ورنہ دوسرے نوٹ تو سو سو کے تھے۔ دس روپے کا نوٹ نکال کر میں نے کتابیں جوں کی توں رکھ دیں اور خود میں بازار کی طرف چل دیا۔ سارا راستہ میرا دل دھک دھک کرتا رہا۔ میں نے کہا۔ "صابر تو آج مارا گیا۔ بس بُرے دن آگئے ہیں تیرے۔ ضرور ہی یہ نوٹ جعلی ہوگا؛ ورنہ کون تجھے اتنی دریا دلی سے اٹھا کر اتنی رقم دے سکتا ہے۔ آج تک تو تجھے کسی نے پھوٹی کوڑی بھی نہ دی۔ یہ تیرا دوست کہاں سے پیدا ہوگیا جو اتنا بڑا حاتم بن بیٹھا ہے۔" یہ سوچتا ہوا میں تیز تیز قدم اٹھاتا ایک بساطی کی دوکان کی طرف بڑھا۔ وہ دکان ابھی کھلی ہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایک ایگل کا قلم خریدتا ہوں اِس سے۔ اتنا عقل کا اندھا تو نہیں ہوگا یہ آدمی کہ جعلی نوٹ لے کر رکھ لے اور قلم دے دے اور بقایا پیسے بھی۔

"ایک ایگل کا قلم دے دو جی بڑھیا سا!" میں نے بڑے حوصلے سے کہا۔

"لو جناب ابھی لو۔ دو والا یا چار روپے والا؟" وہ آدمی نوٹ پکڑتے ہوئے بولا۔

"کوئی سا دے دو بھئی۔ بس چار والا اچھا رہے گا۔" میں نے کہا۔

اُس نے نوٹ کو غور سے دیکھا۔ وہ خُوب کڑکتا ہُوا نیا نوٹ تھا۔ دُکاندار نے خوش ہو کر کہ بوہنی اچھی ہوئی ہے۔ نوٹ گلّے میں ڈالا اور مجھے چار روپے والا قلم دکھا کر بولا:

"یہ لے جاؤ، بڑی دیر چلے گا۔ اِس کی نب جرمنی کی ہے۔"

مَیں نے کہا "بس باقی پیسے دے دیں مجھے۔ یہی ٹھیک ہے۔"

اُس نے چھ روپے مجھے واپس کر دیے اور مَیں قلم لے کر اُنہی قدموں واپس آ گیا۔

اب مَیں بالکل مطمئن تھا۔ وہ نوٹ کسی طرح بھی جعلی نہ تھے۔ حمزہ صاحب نے میرے ساتھ کوئی بے ایمانی نہیں کی ہے۔ مجھے اپنے اِس کمینے پن پر آپ ہی آپ غصّہ آنے لگا کہ خواہ مخواہ مَیں نے ایک شریف دوست کی شرافت پر شُبہ کیا۔ حمزہ صاحب بے چارے مجھے اپنے بچّوں کی طرح چاہتے ہیں۔ مجھے اُن کی نیت پر شُبہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اُن کے پاس جعلی نوٹوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کوئی ٹھگ تھوڑی ہیں۔ یہ سوچتا ہُوا مَیں گھر جا پہنچا۔

میرے ذہن میں صُبح کی خبر نے کھلبلی مچا رکھی تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اُس ٹھگ کو پکڑ کر وہ پانچ ہزار روپے کا انعام حاصل کر لوں۔ جُوں ہی اُس انعام کا خیال آتا تھا میرے بدن میں سنسنی سی پیدا ہوتی تھی۔ مَیں نے قلم سنبھال کر الماری میں رکھا اور پھر باہر نکل گیا۔ مَیں نے سوچا آج اِدھر اُدھر گھوم پھر کر دیکھوں گا

شاید اُس محلے کا کوئی آدمی مجھے مل جائے۔
کافی دیر تک میں اِدھر اُدھر سڑکوں پر گھومتا رہا۔ ہر آدمی کے چہرے کو میں غور سے دیکھتا۔ اُس کے دانت تکتا۔ ڈاڑھی پر غور کرتا گال کے زخم کو تلاش کرتا مگر توبہ کریں اُس محلے کا آدمی مجھے کوئی نہ ملا۔
تھک ہار کر میں گیارہ بجے گھر واپس آیا تو اُس وقت ناصر اور شاکر بھائی کمرے میں بیٹھے کیرم بورڈ کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی شاکر بھائی بولے :

"اِدھر آ صابر یار، مَیں نے اُس مائی کو ابھی دس بجے اُس کوٹھی میں جاتے دیکھا تھا۔ وہ کیا کرنے جاتی ہے وہاں ؟"

"وہ وہاں کام کرتی ہے صفائی ستھرائی پر لگی ہے وہ" مَیں نے کہا۔

"اچھا، جب وہ ہمارے پاس سے گزری تو اُس کی آنکھیں ایک دم شعلے اُگلنے لگیں۔ مگر وہ بولی کچھ نہیں، بس سیدھی اندر گھس گئی!" شاکر صاحب نے کہا۔

"آج میں حمزہ صاحب سے بات کروں گا، ابھی جا کر کہ اس عورت پر ذرا کڑی نگاہ رکھیں" میں نے کہا۔

"نئے کرایے دار کی بات کرتے ہو تم، ہاں یار اُس کو ضرور ساتھ ملاؤ۔ وہ خود ہی پوچھ لے گا اُس سے" ناصر نے کہا۔

"بس ابھی بارہ بجے وہاں جاؤں گا میں۔ ذرا کھانا کھا لوں"

مَیں نے کہا اور تھوڑی دیر بعد کھانا کھا کر مَیں ریاض منزل کی طرف چل دیا۔

ٹھیک بارہ بج رہے تھے اُس وقت جب مَیں اُس کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچا۔ مَیں نے اندر جھانک کر دیکھا تو مائی برآمدے میں سے باہر نکل رہی ہے۔ جب میں لان عبور کر چکا تو وہ مجھے دیکھ کر واپس چلی گئی۔ مَیں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ ایک دم کھُل گیا۔ میرے سامنے کلاچی کھڑا تھا۔

"آ بھئی بچے، کیا حال ہے تیرا، بیٹھ جا اندر۔" جُوں ہی مَیں نے اندر قدم رکھا وہ مائی تیزی سے میری طرف لپکی اور بولی:

"صاب، یہ ہے وُہ لڑکا جو میرا پیچھا کر رہا تھا۔ اِس سے پُوچھیں کہ میرا کیا گُن دیکھا ہے اِس نے؟"

"کیوں بھئی، یہ ہماری نوکرانی کیا کہتی ہے۔ بڑی شکایت کرتی ہے تمہاری۔" کلاچی نے بڑی سنجیدگی سے پُوچھا۔

"جی مَیں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ بس میں اور میرے دونوں بھائی ذرا اِس کے گھر تک گئے تھے۔" مَیں نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"اِدھر کوئی پولیس کا آدمی قتل ہو گیا تھا۔ آپ کو بھی پتا ہو گا۔"

"ہمیں تو کوئی پتا نہیں ہے، تم ایسی خبروں میں بڑی دلچسپی رکھتے ہو۔" کلاچی نے کہا۔

"نہیں جی دلچسپی کی بات نہیں ہے۔ اُس آدمی کو مَیں نے اُس کی مَوت سے ایک دن پہلے اِس مائی سے باہر مَیدان میں اُونچی آواز سے باتیں کرتے سُنا تھا۔ وُہ اِسے ڈانٹ رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید اِس مائی سے پتا چل سکے کہ وہ کیا کہتا تھا اِسے۔ اِس بات سے اُس کے قتل کا اندازہ ہو سکتا تھا"۔ میں نے بڑی تفصیل سے کلاچی کو سمجھایا۔

"تم کیوں تفتیش کرتے پھرتے ہو۔ تمہارا کیا مطلب ہے ایسی باتوں سے۔ اپنی پڑھائی کیوں نہیں کرتے تم"۔ کلاچی بولا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"پڑھائی تو کرتا ہوں جی، بس ایسے ہی خیال آگیا تھا مجھے، ورنہ میرا کوئی خاص مطلب تو نہیں تھا"۔

"تم نے گھر والوں سے بھی ذکر کیا ہوگا؟"

"جی نہیں، مَیں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا"۔

"تمہارے بھائیوں نے بتایا ہوگا"۔

"جی نہیں، وُہ بھی ایسی باتوں کا کسی سے ذکر نہیں کرتے"۔ مَیں نے کہا۔

"دیکھو یہ ہماری نوکرانی ہے اِسے تم خواہ مخواہ بدنام کروگے تو اچھا نہ ہوگا۔ یہ بے چاری محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتی ہے۔ پہلے یہ بھیک مانگتی تھی۔ اب ہمارا کام کرتی ہے۔ اِس کے متعلق نہ تم کسی سے

بات کرو، نہ تمہارے بھائی، سمجھے تم؟ اب یہ ہماری بھی عزت کا معاملہ ہے۔ تمہیں ایسی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

"جی بہت اچھا، میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔" میں نے کہا۔

"اب بے فکر رہو اماں، اگر کوئی بات ہوئی تو ہمارا ذمہ۔ میں نے صابر کو سمجھا دیا ہے۔" کلاچی نے کہا۔

"خدا آپ کا بھلا کرے صاب، ورنہ اِن لونڈوں نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" مائی یہ کہہ کر باہر چلی گئی۔

"بھئی حمزہ صاحب تو یہاں نہیں ہیں اِس وقت۔ کل آ جانا تم۔ کل وہ گھر پر ہی ہوں گے۔" کلاچی نے کہا۔

"جی بہت بہتر۔" یہ کہہ کر میں اُٹھا تو کلاچی نے میرے کندھوں کو تھپتھپا کر کہا۔

"صابر بچے، تمہیں اپنا سارا وقت کتابوں پر صرف کرنا چاہیے۔ یہ مائیوں کا اور نائیوں کا اور نانبائیوں کا پیچھا کرنا چھوڑ دے! ورنہ کوئی چھرا ہی گھونپ دے گا تیرے پیٹ میں۔ بڑے ظالم ہوتے ہیں یہ غنڈے اور ٹھگ اور ڈاکو، سمجھے تم کہ نہیں؟"

"جی میں آپ کی نصیحت پر پورا پورا عمل کروں گا۔" میں نے خوف زدہ ہو کر کہا اور وہاں سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔

کلاچی کی باتوں نے میرے دل پر بڑا خوفناک اثر کیا تھا۔ مگر اُس مائی کی وہ خون آلود آنکھیں میں کسی طرح بھی نہ بھول سکتا تھا۔

مَیں نے سوچا ہو نہ ہو اُس مائی میں کوئی نہ کوئی بَل ضرور ہے جسے میں ہر حال میں سیدھا کر کے رہُوں گا۔ گھر میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد مَیں ایک بار پھر بس میں بیٹھ کر مائی کے مکان کی طرف چل دیا۔ میں نے تہیّہ کر لیا کہ اُس مائی کا راز معلوم کر کے رہُوں گا۔ وُہ ہمارے تعاقب سے اِس قدر بوکھلا کیوں گئی تھی۔

وُہ بڑی ہی سنسان دوپہر تھی۔ زمین دوزخ کی طرح تپ رہی تھی۔ مَیں نے جب اُس کچّی آبادی میں قدم رکھا تو ہر طرف سنّاٹا طاری تھا۔ گلی میں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ سُورج کی آتشیں کرنوں نے سب کو چھتوں کے نیچے دھکیل رکھا تھا۔ مَیں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا وُہ مائی اِس وقت گھر میں موجود ہے اور کون کون آدمی اُس کے گھر میں رہتے ہیں۔ مگر جب میں اُس گلی میں پہنچا تو شاکر بھائی اور ناصر وہاں پہلے سے موجود تھے اور وُہ مائی کے دروازے کی درزوں میں سے اندر جھانک رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ دونوں وہاں سے ہٹ کر میری طرف لپکے اور مجھے مکان کے پچھواڑے کی طرف لے گئے۔ شاکر بھائی بولے:

"آج ہم نے مائی کا پھر پیچھا کیا تھا۔"

"وُہ کیوں کر؟" مَیں نے پوچھا۔

"یار اس مائی کی چال کو تو ہم خُوب پہچانتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم اپنے دوست نسیم سے مل کر بس میں واپس آ رہے تھے کہ

ایک بُرقعہ پوش عورت اُس کچّی آبادی کے شاپ پر اُتری ۔ اُسے دیکھ کر مجھے شبہ ہُوا کہ اُس کی چال تو مائی کی چال سے ملتی جلتی ہے پھر اس نے یہ برقعہ پہننا کب سے شرُوع کر دیا ہے ۔ ہم نے اُس کا پیچھا شروع کر دیا ۔ اُس مائی کے ہاتھ میں ایک بھاری بھرکم ہینڈ بیگ تھا جسے وہ ہاتھ میں لٹکا کر تیزی سے اُدھر کو لپکی ۔ بس میں سے ہمارے ساتھ ایک اور بھی آدمی اُترا ۔ وُہ مجھے تو کوئی پولیس والا معلوم ہوتا تھا ۔ وُہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا اُس مائی کے پیچھے چلا ۔ ہم جب اس ساتھ والی رسُول کالونی میں داخل ہُوئے تو وُہ آدمی ہمارے آگے آگے تھا ۔ وُہ برقعہ پوش عورت اچانک ہی کسی گلی میں غائب ہو گئی ۔ ہم تیسری گلی میں سے نکل کر جب کچّی آبادی کے سامنے پہنچے تو یہ مائی اپنی گلی کی طرف بڑھتی نظر آئی ۔ مجھے یقین ہے کہ اپنا بُرقعہ اور وُہ ہینڈ بیگ یہ کسی کو راستے میں ہی دے آئی ہے ۔ کیوں کہ ایک آدمی اور بھی ہمارے آگے آگے چل رہا تھا اور وُہ بڑے معنی خیز انداز سے پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتا تھا ۔ ہمیں پتا نہیں وُہ آدمی کہاں غائب ہو گیا اور دُوسرا جسے ہم پولیس والا سمجھتے تھے وُہ کہاں چلا گیا ۔"

"اچھا تو اب یہ بُرقعہ بھی پہننے لگی ہے ۔ کمال ہے ۔ مجھے تو یہ پکّی ٹھگ نظر آتی ہے ۔" مَیں نے کہا ۔

"اُس کے مکان کے اندر ایک آدمی بیٹھا ہے ۔ اُس کی رنگت سیاہ ہے اور اُس کی مونچھیں صاف ہیں ۔ پتا نہیں وُہ کیا گھُسر پھُسر کر

رہے ہیں" شاکر بھائی بولے۔

"اچھا میں بھی دیکھ کر آتا ہوں" یہ کہہ کر میں گلی کے اندر جاکر اُن کے دروازے کی درز میں سے دیکھنے لگا۔ وہاں سامنے کمرے کے اندر ایک آدمی بیٹھا تھا جس نے ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور اُس کا رنگ گندمی تھا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی کیوں کہ شاکر بھائی تو کہتے تھے اس کا رنگ سیاہ ہے اور ڈاڑھی مونچھیں صاف ہیں۔ یہ کیا تماشا ہے۔ میں اُسی وقت واپس آگیا اور میں نے شاکر صاحب سے کہا۔

"بھائی صاحب اُس کا تو رنگ گندمی ہے اور اُس نے ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے"

"نہیں یار، میں کوئی اندھا تو نہیں ہوں بھئی ناصر، تُو نے بھی تو دیکھا تھا؟" وہ بولے۔

"ہاں ہاں، اُس کا رنگ سیاہ ہے اور ڈاڑھی مونچھیں صاف ہیں۔"

"ہو سکتا ہے وہاں دو آدمی ہوں" میں نے کہا۔

"نہیں، آدمی وہاں ایک ہی ہے۔ آؤ ہم اُدھر بیٹھ کر ان کی نگرانی کرتے ہیں۔ جب وہ آدمی نکلے گا ہم پہچان لیں گے۔ وہ صحن میں چلا تو ہمیں معلوم ہوا کہ ذرا سا لنگڑاتا بھی ہے" بھائی شاکر نے کہا۔

اب ہم تینوں ہی گلی آبادی سے باہر ایک درخت کے نیچے جا بیٹھے اور دیر تک اُس آدمی کے باہر نکلنے کا انتظار کرتے رہے۔

کوئی دو گھنٹے بعد ایک آدمی اور ایک برقعہ پوش عورت گلی میں سے

باہر نکلے۔ عورت نے سفید لٹھے کا بُرقعہ اوڑھ رکھا تھا اور اُس آدمی نے سفید قمیص شلوار پہن رکھی تھی اور اُس کے سر پر پگڑی تھی طرّے دار اور وُہ تھوڑا سا لنگڑا کر چلتا تھا۔

"ارے یہ وُہی آدمی ہو جو دائیں پیر سے لنگڑاتا ہے مگر اس نے ڈاڑھی کس طرح پیدا کر لی ہے۔" شاکر بھائی حیرت زدہ ہو کر بولے۔

"اور اس کا رنگ گندمی کس طرح ہو گیا؟" ناصر بولا۔

"کمال ہے یار، اور یہ مائی کی چال تمہیں نظر نہیں آتی؟ بالکل وُہی مائی ہے۔"

"ہاں یہ بھی وُہی مائی ہے۔ اب یہ سفید بُرقعہ پہنے ہُوئے ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ سیاہ بُرقعہ میں تھی۔"

"حیرت ہے یار، آؤ ان کا پیچھا کریں۔" مَیں نے کہا۔

وُہ دونوں ہم سے کافی فاصلے پر سے ہو کر سڑک کی طرف چلے گئے ہم بھی اُن کی نظروں سے بچتے بچاتے اُن کے پیچھے چل دیے۔

"ارے اس آدمی کے ہاتھ میں وُہی بیگ ہے جو مائی کے ہاتھ میں تھا۔" ناصر نے غور سے دیکھتے ہُوئے کہا۔

"ہاں یار، وُہی سیاہ رنگ چمڑے کا بیگ، کمال ہے۔" شاکر بھائی نے آنکھیں جھپکتے ہُوئے کہا۔

"بھئی، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔" مَیں نے حیران ہو کر کہا۔

سڑک پر پہنچتے ہی اُنہیں رکشہ مل گیا اور وُہ اُس میں سوار ہو گئے۔

"بہت بُری ہُوئی یار، پیسے ہوتے تو ہم بھی رکشے میں بیٹھ جاتے"
بھائی شاکر نے کہا۔

"مَیں بھی اپنے پیسے گھر چھوڑ آیا ہُوں" ناصر بولا۔

"پیسے ہیں میرے پاس، تم رکشہ روکو" مَیں نے ایک رکشہ دیکھتے ہُوئے کہا۔ وہ رکشہ روکا گیا تو ہم اُس میں تینوں ہی بیٹھ گئے۔ سیدھی سڑک پر ماں کا رکشہ ابھی ہماری نظروں میں تھا۔

"اس رکشے کا پیچھا کرو یار، مگر اُسے پتہ نہ چلے" مَیں نے ڈرائیور سے کہا۔

"ہاں، ہم تمہیں انعام بھی دیں گے" شاکر بھائی نے دریا دلی سے کہا۔

"یہ انعام آپ اپنی گرہ خاص سے عطا فرمائیں گے" مَیں نے حیران ہو کر کہا۔

"ارے آٹھ آنے زیادہ دے دینا۔ پیسے تو ہیں تیرے پاس" بھائی صاحب نے کہا۔

"وہ کس طرح معلوم ہُوا آپ کو" مَیں نے کہا۔

"ابھی خود ہی تو کہ رہا تھا تُو — اور بڑے زور سے کہہ رہا تھا۔ کیوں بھئی ناصر، جس کے پاس تھوڑے پیسے ہوں، وہ اتنے زور سے تو نہیں کہتا کہ پیسے ہیں میرے پاس۔ تم رکشہ روکو" بھائی صاحب نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

"چلیں آپ کہتے ہیں تو آج ہم انعام بھی دے دیں گے۔ ذرا تیز چلو بھائی میاں، بڑا اہم معاملہ ہے۔ دوزخ تک اس رکشے کا پیچھا کرو"

مَیں نے ڈرائیور سے کہا اور اُس نے رفتار اور بھی تیز کر دی۔

چھٹیوں کا یہی فائدہ ہوتا ہے کہ اندھے گُھٹتے ہر فول کے پیچھے جس طرف چاہیں مُنہ اُٹھا کر چل سکتے ہیں۔ کوئی روک نہیں سکتا اور ان دنوں تو ہیں سمجھا تھا کہ ہم ایک بہت ہی اہم کام کر رہے ہیں۔

ڈرائیور ہمارا سمجھدار تھا۔ اُس نے اپنے رکشے کو فاصلے پر بھی رکھا اور دُوسرے رکشے کو نظروں سے غائب بھی نہ ہونے دیا۔

اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ وہ رکشہ سیدھا ماڈل ٹاؤن کی طرف جا رہا تھا اور وُہ بھی اس کوٹھی کی طرف۔ ابھی ہم ایک فرلانگ دُور ہی تھے جب ہم نے دیکھا کہ ہائی ریاض منزل کے سامنے پہنچ کر اُتر گئی۔ دُوسرا آدمی بھی اُس کے ساتھ ہی اُتر گیا اور وُہ دونوں پھاٹک کھول کر اندر گھُس گئے۔ ہم بھی رکشے سے اُترے ایک روپے دو روپے کرایہ بنتا تھا۔ مَیں نے دو روپے ڈرائیور کو دیے تو وہ خوش ہو گیا۔ بھلا مانس آدمی تھا۔ اُس نے نہیں پُوچھا کہ یہ کس کھیل میں مصروف ہو تم لوگ — اور لوگوں کا بُوں بلاؤں کی طرح کیوں پیچھا کرتے پھرتے ہو۔

# بابٌ

رکشے والا چلا گیا تو مَیں نے کہا :

"اب کیا ارادے ہیں یار ؟"

"بھئی تم اندر جا کر دیکھو کہ وہ لوگ کیا کرتے ہیں ؟" ناصر نے کہا ۔

"یار مجھے ڈر ہے کہیں وہ شک نہ کریں !" مَیں نے کہا ۔

"ڈرو مت ، بس اپنے دوست سے ملنے کے لیے بے دھڑک اندر چلے جاؤ ۔" شاکر بھائی نے کہا ۔

"بہت اچھا ، قبلہ وکعبہ جناب بھائی محمد شاکر ......"

"اچھا اچھا ، زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں بس جاؤ اس مائی کی سی آئی ڈی کرو ۔" بھائی صاحب چڑ کر بولے ۔

مَیں اُنھیں ریاض منزل کی دیوار کے قریب درخت کے نیچے کھڑا کر کے سہما سہما سا کوٹھی کے اندر داخل ہوا اور دبے پاؤں ہال کمرے کی کھڑکی کے ساتھ جا لگا ۔ وہاں پردہ کھنچا تھا ۔ پھر بھی پردے کے درمیان میں سے مجھے کمرہ صاف نظر آتا تھا ۔

جوں ہی مَیں نے شیشے میں سے پردے کے پار اندر نگاہ ڈالی ، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ مائی صاف ستھرے خوب صورت کپڑے پہنے

کرسی پر بیٹھی تھی اور اُس کے ساتھ کی کرسی پر وُہی کالے بھجنگ چوہان صاحب بیٹھے تھے اور اُن کے سامنے میز کے دُوسری طرف قلاچی بیٹھا تھا اور میز پر اُنہوں نے وُہ بھاری بھرکم بیگ کھول رکھا تھا اور اُس بیگ میں سے جو کچھ نکال کر اُنہوں نے میز پر دھرا ہُوا تھا اُسے دیکھ کر تو لرز ہی گیا۔ وُہ سونا تھا، چمکتا ہُوا سونا۔ اینٹیں سی بنی ہُوئی تھیں سونے کی اور قلاچی ایک خوبصُورت سا ترازو لے کر وُہ سونا تول رہا تھا۔ وہ سب اس دیوار کے قریب ہی کرسیوں پر بیٹھے تھے جس کی کھڑکی کے ساتھ میں لگا کھڑا تھا۔

اچانک ٹھک جیسی آواز پَیدا ہُوئی اور میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ ہال کمرے کے فرش کے عین درمیان میں ایک کھڑکی سی نمودار ہُوئی یُوں، جیسے دونوں طرف سے فرش سمٹ رہا ہو اور اُس کے ساتھ ہی حمزہ صاحب کا چہرہ نظر آیا۔ دُوسرے ہی لمحے وُہ کمرے کے اندر پہنچ چکے تھے اور اُن کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا جیسا اُس مائی کے پاس تھا۔ وُہ کھڑکی آپ ہی آپ بند ہو گئی۔

وُہ بیگ لاکر اُنہوں نے میز پر رکھا۔ قلاچی نے ایک ایک کرکے ساری اینٹیں تول کر بیگ میں بند کر دیں۔ پھر حمزہ صاحب نے اپنا بیگ کھولا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اُس میں بھی سونے کی ویسی ہی اینٹیں بھری تھیں اور اُن میں بھی کوئی چھوٹی تھی اور کوئی بڑی۔

یا پیر دستگیر، کیا یہ وُہی سونا نہیں ہے، جس کے لیے کراچی اور لاہور کے صراف بیٹھے سر پیٹ رہے ہیں، جس کے لیے اُنہوں نے کروڑ

انعام مقرر کر رکھے ہیں۔ اچانک مجھے سیٹی کی آواز سُنائی دی۔ شاکر بھائی مجھے کسی بات پر ہوشیار کر رہے تھے۔ مگر ابھی میں وہاں سے ہٹ بھی نہ سکا تھا کہ پھاٹک ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور ایک سیاہ رنگ کی کار دندناتی ہوئی اندر گھس آئی۔ مَیں بھاگ کر دائیں طرف لپکا مگر وہ کار ایک دم رُکی اور اُس میں سے ایک آدمی نکل کر تیزی سے میرے پیچھے بھاگا۔ مَیں اُس سے بچنے کے لیے کوٹھی کے پچھلے حصّے کی طرف سرپٹ بھاگا۔ اچانک اُس آدمی نے بڑی خوفناک سیٹی بجائی تو کوارٹروں میں سے ایک آدمی تیر کی طرح میری طرف دوڑا۔ اُس سے بچنے کے لیے مَیں بائیں طرف نکلا تو سامنے سے حمزہ صاحب اور قلاچی برآمدے میں نکل کر میری طرف لپکے۔ اچانک اس آدمی نے جو کار سے نکلا تھا، پستول تان لیا اور بولا:

"ٹھہر جا! ورنہ گولی مار دوں گا!"

"نہیں نہیں، ایسا مت کرو۔ ٹھہر جا صابر بیٹے!" حمزہ صاحب نے آگے بڑھ کر مجھے روکتے ہوئے کہا۔ اُنہیں دیکھ کر مَیں نے اپنی رفتار سُست کر دی تھی۔

"کون ہے یہ لڑکا؟" وُہ آدمی جس نے پستول تان رکھا تھا بڑے غضبناک لہجے میں بولا۔ مَیں نے اُسے غور سے دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اُس کا رنگ بھی توے کی طرح سیاہ تھا اور اس کے کان کے قریب گہرے زخم کا نشان تھا۔ ناک اُس کی چپٹی تھی۔ مگر دانت اُس

کے سب کے سب پورے تھے۔ ایک بھی ٹوٹا ہُوا نہ تھا۔

وہ اب بالکل میرے سامنے کھڑا تھا۔

"یہ ہمارا کیرم بورڈ کا ساتھی ہے۔ حمزہ صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اوہ حمزہ صاحب، آپ بالکل گدھے ہیں۔ کمرے میں آپ کیا کر رہے تھے۔ یہ کھڑکی کے ساتھ لگا شیشے میں سے اندر دیکھ رہا تھا۔" وہ آدمی بولا۔

"کیا کہتے ہیں آپ ٹھاکر صاحب؟" قلاچی نے ایک دم حیران ہو کر کہا۔

"مَیں سچ کہتا ہُوں — اور اُدھر دیکھیں، دو لڑکے اُس دیوار کے ساتھ منڈلا رہے ہیں وُہ اِس کے ساتھی معلوم ہوتے ہیں وُہ دیکھیں" ٹھاکر صاحب نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔ ناصر اور شاکر بھائی کے حیران و پریشان چہرے دیوار پر نظر آ رہے تھے۔

تب اچانک ٹھاکر نے پستول پر ہاتھ رکھ کر ٹک ٹک کی آواز پیدا کی۔ مَیں نے جو اس کا ہاتھ دیکھا تو وہاں بھی مجھے ویسی ہی انگوٹھی نظر آئی جیسی حمزہ صاحب اور قلاچی نے پہن رکھی تھی۔ اُس کے جواب میں قلاچی نے بھی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹک ٹک کی آواز پیدا کی۔ اِس پر حمزہ صاحب بولے:

"صابر بیٹے، یہ بھائی ہیں تمہارے؟"

"جی ہاں۔" مَیں نے کہا۔ مَیں سخت سہما ہُوا تھا۔

"اچھا تم ان دونوں کو اندر بُلا لو۔ مگر دیکھو بھاگنا نہیں۔ ہم تمہیں انعام دیں گے۔ جاؤ قلاچی انہیں بھی اندر لے آؤ۔" حمزہ صاحب نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔

یہ بات سُنتے ہی ٹھاکر نے پستول جیب میں رکھا اور وُہ سب برآمدے میں چلے گئے۔ قلاچی مجھے اپنے ساتھ لے کر پھاٹک کی طرف بڑھا۔ ناصر اور شاکر بھائی مجھے باہر آتا دیکھ کر پھاٹک کے قریب آ گئے۔

"انہیں کہو یہ اندر آ جائیں۔" قلاچی نے مجھے دبی زبان سے کہا۔

"آپ ہمیں ماریں گے تو نہیں؟" مَیں نے کہا۔

"نہیں بھئی حمزہ صاحب کے ہوتے ہُوئے تمہیں کون مار سکتا ہے۔ انہیں اندر بُلا لو۔" قلاچی بولا۔

"بھائی صاحب اندر آ جائیں۔" مَیں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"تم باہر کیوں نہیں آتے ہو؟" شاکر بھائی نے پُوچھا۔

"بھئی وُہ حمزہ صاحب آپ سب کو اندر بُلاتے ہیں۔" قلاچی بولا۔

"نہیں ہم نہیں اندر آتے۔ آپ ہمیں ماریں گے۔" بھائی صاحب بولے۔

"یار ہم کوئی دُشمن ہیں تمہارے۔ آ جاؤ اندر حمزہ صاحب بُلاتے ہیں۔" قلاچی نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔ اُس کی یہ بات سُن کر بھائی صاحب اور ناصر دونوں پھاٹک کے اندر آ گئے۔

قلاچی نے پھاٹک کو اندر سے چٹخنی لگائی اور ہم تینوں کو ساتھ لے کر وہ برآمدے کی طرف بڑھا۔ حمزہ صاحب باہر ہی کھڑے تھے۔ ہمیں

تو بیحد خوفزدہ تھا۔ کیونکہ ٹھاکر کا حلیہ بالکل وُہی تھا جو اخبار میں چھپا تھا۔ اور اب ساری بات میری سمجھ میں آچکی تھی۔ اپنی جان کی فکر تو تھی ہی مجھے افسوس یہ تھا کہ شاکر بھائی اور ناصر بیچارے خواہ مخواہ ہی مارے جائیں گے۔ کیونکہ مجھے ان لوگوں سے کسی نیکی کی توقع نہیں تھی۔ وُہ خطرناک مجرموں کا اڈا تھا۔ ایسے خطرناک مجرموں کا جنہیں اب تک پولیس بھی نہ پکڑ سکی تھی۔ جو اتنے دلیر تھے کہ پولیس کے آدمی کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دینے سے نہ چُوکے تھے۔ اُن کے قبضے میں ہماری جان آگئی تو وُہ خُدا جانے ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں۔ کتنا میرا جی چاہتا تھا کہ میرے وُہ دونوں بھائی بھاگ جائیں۔ مگر میں اتنا خوفزدہ تھا اور اس قدر میرا دماغ خراب ہو چکا تھا کہ مَیں بروقت کچھ بھی نہ کر سکا۔ اب اندر سے میرا دل یُوں یُوں کر رہا تھا اور میرے دونوں بھائی بھی سخت سہمے ہُوئے تھے۔

حمزہ صاحب ہمیں دیکھ کر مُسکرائے اور بولے:

"آؤ بھئی دوستو! تم دُور کھڑے ہو کر کیا دیکھتے تھے۔ تمہیں اندر آنے سے بھلا کون روک سکتا ہے۔ چلو اندر بیٹھو!"

مَیں نے ہچکچاتے ہُوئے برآمدے میں قدم رکھا اور کہا:

"جی اب اجازت دیں ہم گھر جائیں گے!" ہال کا دروازہ کھُل چکا تھا۔

"چلو اندر سُور کے بچو! آپ ہٹ جائیں جی حمزہ صاحب۔ کیا لولو پوپو کر رہے ہیں آپ!" قلاچی نے ایک دم ہم تینوں کو بازو تان کر اندر دھکیلتے ہُوئے کہا۔ اُس کی گرجدار آواز سُن کر ٹھاکر دوسری طرف سے

جھپٹ کر آگے بڑھا اور اُن دونوں نے زبردستی ہمیں ہال کمرے میں دھکیل دیا۔ اب وہ بدترین وقت سر پر آچکا تھا جس سے ہم ڈرتے تھے۔ حمزہ صاحب دوسرے آدمیوں کے ہمراہ اندر آئے تو میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولے: "بیٹھ جاؤ صابر اور گھبراؤ مت۔ ہم جو کچھ پوچھیں ہمیں سچ سچ بتادو، پھر ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

وہ مائی اور اُس کے ساتھ جو آدمی آیا تھا وہ ہمیں کہیں پر بھی اب نظر نہ آتے تھے۔ کمرے میں اب قلاچی، ٹھاکر اور حمزہ صاحب ہی تھے۔ تین ہی وہ اور تین ہی ہم، کمرے میں سے بیگ اور سونا سب غائب ہو چکے تھے۔

"آپ چُپ رہیں حمزہ صاحب، آپ نے ہمارا بیڑا غرق کر دیا ہے میں سوال کروں گا۔" قلاچی نے کہا۔

"کیا بکتے ہو تم قلاچی۔ ہوش سے بات کرو۔ تم جو چاہو ان سے پوچھ سکتے ہو۔ مگر میرے سامنے بدتمیزی کی جرأت دوبارہ نہ کرنا" حمزہ صاحب نے بڑے غضبناک لہجے میں کہا۔ اُن کی اِس بات کا قلاچی پر خاطر خواہ اثر ہُوا اور وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ تک غور کرتا رہا۔ پھر اُس نے میز پر اپنی انگوٹھی بجانی شروع کر دی۔ ٹھاکر اُس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اُس نے بھی وہی عمل شروع کر دیا۔ کیوں کہ اُس کی انگلی میں بھی ویسی ہی انگوٹھی تھی۔ وہ چند منٹ تک قلاچی کی ٹھک ٹھک سُنتا رہا اس کے دوران میں کبھی کبھی حمزہ صاحب بڑے طیش سے کرسی کے بازو پر اپنی انگوٹھی مارتے۔ چند منٹ تک یہ ناٹک جاری رہا۔ جس پر

حمزہ صاحب کا غصّہ لحظہ بلحظہ تیز ہوتا رہا۔ پھر وہ تینوں خاموش ہو گئے۔ ہم مجرموں کی طرح اُن کے سامنے کھڑے تھے۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد قلاچی نے خود کو سنبھالا اور مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے بولا:

"تم بارہ بجے یہاں آئے تھے۔ مَیں نے تمہیں کہا تھا کہ حمزہ صاحب یہاں نہیں ہیں کل آنا۔ پھر تم دوبارہ یہاں کیوں آئے؟"

"مَیں حمزہ صاحب کو دیکھنے آیا تھا۔" مَیں نے کہا۔

"تم نے آتے ہی دستک کیوں نہ دی؟" اُس نے پوچھا۔

"مَیں نے سوچا، پہلے دیکھ لوں کہ کمرے میں وہ ہیں بھی یا نہیں!"

"تم کب سے کھڑے تھے یہاں؟"

"جی میں ابھی آیا ہی تھا کہ کار اندر آگئی۔"

"تم کار کو دیکھ کر بھاگ کیوں نکلے؟"

"جی مَیں ڈر گیا تھا کہ آپ ناراض نہ ہوں کہ کیوں میں وقت بے وقت آجاتا ہوں۔" مَیں نے دلجمعی سے کہا۔

"تم نے کھڑکی کے اندر کیا دیکھا؟"

"جی کچھ نہیں، سامنے پردہ لٹک رہا تھا۔ اِس لیے مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔" مَیں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو صابر، تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ ہم تمہیں خوفناک سزا دیں گے۔ سچ سچ بتاؤ تم نے اِس کمرے میں

کیا کچھ دیکھا" قلاچی بولا۔

"جی مَیں سچ کہتا ہوں۔ پردے کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہ آتا تھا" مَیں نے کہا۔

"تم نے اپنے ساتھیوں کو باہر کیوں ٹھہرا دیا؟"

"جی وُہ اندر آتے ہُوئے ڈرتے تھے کیوں کہ اُن کا کوئی یہاں واقف نہ تھا" مَیں نے کہا۔

"تم بکواس کرتے ہو۔ جھُوٹ بکتے ہو' تم نے اس بڑھیا کا پیچھا آج پھر کیا تھا۔ جب وُہ بس میں سے اُتر کر گھر کی طرف چلی تو تم نے اس کا پیچھا کیا۔ وُہ خُود کہتی ہے کہ اُس نے دو لڑکوں کو دیکھا تھا لیکن وہ بڑی مشکلوں سے ایک گلی کا چکر دے کر چھوڑ آئی۔ پھر وُہ آگے نہ آسکے۔ اب وہ پھر گھر سے باہر نکلی تو تم اُس کے پیچھے چل دیے۔ تم چھُپ کر دیکھتے رہے کہ وُہ اِس کمرے میں کیا کرتی ہے۔ تم نے خدا جانے کیا کیا کچھ سوچ لیا ہے۔ مَیں تم تینوں کا خُون پی لُوں گا۔ بتاؤ تمہیں کس نے مائی کے پیچھے لگا رکھا ہے"

"جی کسی نے بھی نہیں" مَیں نے کہا۔

"وُہ آدمی جو چند دن پہلے مَرا تھا' تمہارا واقف تھا؟"

"جی نہیں' مَیں نے اُس کی تصویر اخبار میں دیکھی تھی" مَیں نے کہا۔

"پھر تم نے مائی سے اُس آدمی کے متعلق کیوں پُوچھا؟" قلاچی

اپنی خوفناک آنکھیں گھما کر بولا
"جی میں نے مانی کو اس سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔
"سُنا آپ نے حمزہ صاحب، یہ لڑکا کس طرح جال بُن رہا ہے۔"
"میں سُن رہا ہوں، سب کچھ سُن رہا ہوں۔ تم نتیجہ نکال لو پہلے۔"
حمزہ صاحب نے سگار سُلگاتے ہوئے کہا۔
"یہ لڑکا صاف جھوٹ بول رہا ہے۔" یہ کہہ کر قلاچی نے انگوٹھی کے ساتھ میز بجائی۔ اِس پر حمزہ صاحب اُٹھ کر پچھلے سے باہر چلے گئے پھر وہ تھوڑی دیر بعد اچانک دروازے میں نمودار ہوئے تو اُن کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دُوسرے میں سگار۔
کلاچی، ان لڑکوں کو باہر جانے دو۔ یہ میرا حکم ہے۔" وہ گرجدار آواز میں بولے۔
"نہیں، میں اپنے دُشمن کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ اِس پستول کو جیب میں ڈال لو۔" قلاچی نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔
"ٹھاکر، ہاتھ اُوپر اُٹھا لو، ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ صابر کا راستہ چھوڑ دو۔" ٹھاکر کو مخاطب اُنھوں نے اِس لیے کیا کہ وہ شاید پستول نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈال رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔"
"یہ بدترین قسم کی غداری ہے۔" قلاچی نے کہا۔
"نہیں، یہ لڑکے معصوم ہیں۔ اِن کی طرف سے میں ضمانت دیتا

ہُوں کہ یہ میری وجہ سے مُنہ نہیں کھولیں گے۔ اگر انہیں کچھ معلوم بھی ہے تو یہ چُپ رہیں گے۔ اِن کو آزاد کر دو۔" جُوں ہی اُن کے مُنہ سے یہ بات نکلی وُہ کالا بھجنگ آدمی جو مائی کے ساتھ آیا تھا دبے پاؤں حمزہ صاحب کے پیچھے سے آکر اُن پر چیتے کی طرح جھپٹا۔ وُہ اچانک پتا نہیں کہاں سے نمودار ہُوا تھا۔ اُس نے حمزہ صاحب کو کچھ اِس طرح جکڑ لیا کہ وُہ بے بس ہو گئے۔ مگر اُن کے پستول کا رُخ ابھی تک کلاچی کی طرف تھا۔ اُس آدمی نے ایک دم جو حمزہ صاحب کو پیچھے گھسیٹا تو اُن کے پستول کا رُخ دروازے کے پَٹ کی طرف ہو گیا بس اتنی سی مُہلت کافی تھی۔ کلاچی نے دَوڑ کر اُن کا ہاتھ پکڑا اور زبردستی اُن کی کلائی مروڑ کر اُس نے پستول چھین لیا۔

مَیں نے موقع غنیمت جان کر دوسرے دروازے میں بھاگنے کی کوشش کی تو ٹھاکر نے مجھے دبوچ لیا۔

شاکر بھائی اور ناصر دروازے تک پہنچ ہی رہے تھے کہ سامنے برآمدے میں سے مصدر خان اُن پر جھپٹ پڑا اور اُس نے اُن دونوں کو بازوؤں میں سمیٹ کر پھر اندر دھکیل دیا۔ خُدا جانے وُہ مصدر خان اُس وقت کہاں سے آٹپکا تھا۔

وُہ حمزہ صاحب کو گھسیٹتے ہُوئے دُوسرے کمرے میں لے گئے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد کلاچی پستول تان کر ہمارے کمرے میں واپس آ گیا اُس نے دروازے کے ساتھ کھڑے ہو کر انگوٹھی سے ٹھک ٹھک کی تو

مصدر خان نے کہا۔

"اوئے، اُس دیوار کی طرف مُنہ کرو۔" اُس نے میرا مُنہ کوٹھی کے پچھلے حصّے کی طرف موڑا۔ پھر دُوسروں کا مُنہ بھی اُس نے اُسی رُخ پر پھیر دیا۔ اچانک کمرے میں ٹھک کی آواز پیدا ہُوئی۔ ہم نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو فرش کے عین بیچ میں کھڑکی نمودار ہو گئی۔ فرش سمٹ گیا۔

"چلو اوئے مُوذی کے بچو، نیچے اُترو۔" قلاچی نے ہمیں حُکم دیا اور مصدر خان نے شاکر بھائی کو اُس کھڑکی کے منہ پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔

"نہیں، نہیں، خُدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔ ہم پھر کبھی اِدھر نہیں آئیں گے۔" شاکر بھائی نے ایک دم چیختے ہُوئے کہا۔ اُن کا رنگ زرد ہو چکا تھا اور اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"خو چالو۔ بکری کا مافق چیخ نہ مارو چالو۔" مصدر خان نے بھائی صاحب کو دھکیلتے ہُوئے کہا

"نہیں، مَیں نیچے نہیں جاؤں گا۔" بھائی صاحب نے ایک دم اکڑ کر کہا۔ اب اُن کے چہرے پر زبردست غُصّے کے آثار نمایاں تھے۔ اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک دم مصدر خان پر حملہ کر دیا اور اُس سے یُوں لپٹ گئے کہ مصدر خان کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ اِس پر ہمیں بھی شہ ملی اور ہم بھی اُس پر پل پڑے اور اُس پر گھونسوں کی بارش برسانے لگے۔ قلاچی نے پستول جیب میں ڈالا اور پیچھے سے آ کر میری پسلی میں زبردست مُکّا مارا۔ ناصر اور شاکر بھائی مصدر خان سے نپٹ رہے تھے؛

کر پیچھے سے ٹھاکر آ گیا۔ اُس نے ناصر کو پکڑ کر دھڑام سے اُس کھلی کھڑکی کے نیچے پھینک دیا۔ اُس کی چیخ سُنائی دی اور میں نے قلاچی کے ہاتھ پر اپنے دانت گاڑ دیے۔ شاکر بھائی نے خدا جانے کیا کیا کہ مصدر خان کی چیخ سُنائی دی۔ میں نے قلاچی سے اُلجھے ہوئے ایک نظر مصدر خان پر ڈالی تو اُس کی گردن لہولہان ہو رہی تھی۔ بھائی صاحب کے ہاتھ میں ایک لمبا چاقو تھا۔ اب ٹھاکر اُن کے چاقو سے بچ کر انہیں پکڑنے کی کوشش میں تھا۔ مگر شاکر بھائی برابر چاقو لہراتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے اور پھر ایک دم ٹھس کی آواز پیدا ہوئی اور شاکر بھائی چیخ کر دیوار کے ساتھ گر پڑے۔ ٹھاکر نے اُن پر عجیب طرح سے گولی چلائی تھی جس سے کوئی آواز پیدا نہ ہوئی تھی۔ قلاچی نے ایک دم غضبناک ہو کر مجھے میمنے کی طرح بانہوں میں اُٹھایا اور دھڑام سے اس کنوئیں میں پھینک دیا۔ جس کے مُنہ پر فرش میں کھڑکی لگی تھی۔ میں ناصر کے اُوپر ہی گرا۔ وہ ہوش میں تھا۔ اُس نے مجھے فوراً سنبھالا۔ اُوپر سے روشنی نیچے آ رہی تھی۔ وہ بے چارا شاید سر کی چوٹ کی وجہ سے نڈھال تھا۔ بڑی مشکل سے بولا:

"میرے سر میں شدید درد ہے!"

"میرے اپنے ہاتھ پر سخت چوٹ لگی ہے یار، ہم تو مصیبت میں پھنس گئے ہیں!" میں نے کہا۔

"اب کیا ہوگا صابر؟ یہ لوگ تو ہمیں جان سے مار دیں گے!"

ناصر نے کہا۔ وہ بے حد خوفزدہ ہو رہا تھا اور اُس کی آواز بُری طرح لرز رہی تھی۔

"اللہ پر بھروسہ رکھو ناصر، بچانے والے کا ہاتھ زیادہ مضبوط ہے" مَیں نے کہا۔ سامنے سیڑھیاں تھیں، چھوٹی چھوٹی لکڑی کی بنی ہوئیں۔ مَیں نے چاہا کہ اُس پر چڑھ کر کمرے میں چلا جاؤں۔ مگر اچانک شاکر بھائی کو ان بُزدلوں نے دھڑام سے نیچے پھینک دیا۔ اُن کو ہم دونوں نے بڑی مشکلوں سے زمین پر گرنے سے بچایا۔ جب وہ سیدھے کھڑے ہُوئے تو بولے:

"میری ٹانگ میں سخت درد ہے۔ گولی پنڈلی میں لگی ہے" مَیں نے اُن کی دائیں ٹانگ ٹٹول کر دیکھی تو میرا ہاتھ خُون سے تر ہوگیا۔

"لائیں مَیں رومال باندھ دُوں" مَیں نے جیب سے رُومال نکال کر اُن کی پنڈلی پر گھٹنے سے نیچے کس کر باندھا جس سے خُون بہنا کچھ کم ہوگیا۔ اچانک روشنی تاریکی میں بدل گئی۔ ٹھک جیسی آواز پیدا ہُوئی اور وہ کھڑکی بند ہوگئی جس کی راہ سے ہم نیچے اُترے تھے۔

"یار اُن لوگوں نے حمزہ صاحب کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا وُہ تو اُن کے ساتھی ہیں۔" ناصر بولا۔

"یہی تو مزے کی بات ہے۔ وُہ اپنی جان بچانے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں" مَیں نے کہا۔

"مگر اب کیا ہوگا؟ ہم تو قید ہو کر رہ گئے ہیں" ناصر نے کہا۔

"یار ناصر، مَیں کہیں مَر تو نہ جاؤں گا، مجھے گولی لگی تھی۔" شاکر بھائی نے بڑے فکر مند لہجے میں کہا — یہ بات اُنہوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہی کہ میری ہنسی نہ رُک سکی۔ مَیں نے کہا:

"آپ قیامت تک نہیں مَر سکتے، جناب قبلہ بھائی محمد شاکر صاحب۔ یہ چھوٹی سی گولی کیا چیز ہے۔ یہاں سے باہر نکلنے کی تجویز سوچیں۔"

"جناب قبلہ کے چاچا کوئی مَیں نے بنایا تھا تہہ خانہ۔ مجھے کیا پتا یہاں سے کس طرح نکلتے ہیں۔"

"تو پھر صبر شکر کریں اِس قبر میں بیٹھ کر۔ ابھی حساب کتاب کے فرشتے آئیں گے۔ وُہ پوچھیں گے۔ بھائی صاحب وُہ کیا بتایا تھا مولوی صاحب نے، کیا کہا کرتے ہیں فرشتے۔ آپ کو تو تجربہ ہوگا؟" مَیں نے پُوچھا۔

"ہاں ہاں، مَیں تو روز ہی مَر کر قبر میں جایا کرتا ہُوں۔ لعنت ہے تیری شکل پر —" بھائی صاحب نے کہا۔

"وُہ پُوچھیں گے مَن رَبُّکَ۔ پھر کہیں گے مَن رَسُولُکَ۔" مَیں نے کہا۔

"ہاں، یہ تو پُوچھا ہی کرتے ہیں مگر کوئی تدبیر سوچ۔ یہاں کب تک پڑے رہیں گے ہم؟" ناصر بولا۔

"بھائی صاحب کوئی ٹارچ وغیرہ تو ہوگی آپ کے پاس۔" مَیں نے بھائی صاحب کو اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے کہا۔ وُہ دیوار کے ساتھ ٹیک کر بیٹھے تھے۔ باہر کی نسبت وہاں گرمی کم تھی۔ تہہ خانہ تھا وہ۔ جہاں ہوا

کا بھی اچھا انتظام تھا۔

"ہاں ہاں، ٹارچ نہیں گیس لیمپ ہے میرے پاس۔ مَیں ڈاکے مارتا پھرتا ہُوں نا۔ پھنسا کے مارا ہے تُو نے۔ نہ ہمیں اندر بُلاتا، بُھگت لیتا خود ہی تُو!"

"بھئی بڑے خود غرض ہیں آپ یعنی مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں ہے آپ کو!"

"ہمدردی خاک کریں ہم۔ ہر بات پر تو تجھے مذاق سُوجھتا ہے!"

"بس یہی عیب ہے میرے اندر! ورنہ تو مَیں آپ کا سچا خادم ہُوں!"

"پھر اب کیا کروں مَیں؟" وُہ جھلا کر بولے۔

"وُہ کبھی کبھی آپ چھُپ کر سگریٹ پیا کرتے تھے۔ ماچس تو ضرور ہوگی آپ کے پاس؟" مَیں نے کہا۔

"ارے ہاں، خوب یاد دلایا بھئی تُو نے۔ ماچس تو میرے پاس بھی ہے۔" ناصر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"آنجناب کے پاس یہ ماچس کیسے آگئی؟" مَیں نے پُوچھا۔

"مَیں نے آج خود چائے پکائی تھی بھائی صاحب کے لیے۔ کیوں بھائی صاحب، کیسی چائے تھی وُہ!"

"تُم دونوں سے خُدا سمجھے۔ یہ کوئی ایسی باتوں کا وقت ہے؟" بھائی صاحب بولے۔

"تو کیا خیال ہے آپ کا، ہم قلابچی مُردہ باد کے نعرے لگائیں یہاں!"

جو نہی ہے بھگتیں گے۔ اگر انہوں نے گولی نہ ماری تو پھر کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔" میں نے ماچس لے کر جلاتے ہوئے کہا۔

وہ تہہ خانہ ماچس سے ذرا روشن ہوا تو اُس میں ہمیں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے سوئچ جیسے لگے ہوئے نظر آئے۔

"یار یہ اتنے سارے سوئچ کیسے ہیں یہاں، کوئی بجلی گھر تو نہیں ہے یہ۔" ناصر نے کہا۔

"یہ بجلی گھر نہیں بلکہ بوچڑ خانہ ہے۔ یہاں ہم ایسے گنہگاروں کا جھٹکا کیا جاتا ہے۔" میں نے دوسری ماچس جلائی اور سوئچ ٹٹولنے شروع کیے۔

"یار میرا خیال ہے کہ انہی میں سے کسی بٹن کو دبانے سے دروازہ کھلتا ہے مگر ابھی ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ وہ سب لوگ ابھی اوپر بیٹھے ہوں گے۔" ناصر بولا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر پتا تو چلے کہ کون سا بٹن کام کرے گا۔" یہ کہہ کر میں نے ایک ایک کر کے دیوار کے بٹن دبانے شروع کیے مگر کوئی بھی نتیجہ نہ نکلا۔ پہلی دیوار میں چھ سوئچ لگے تھے۔ وہ میں نے باری باری سب دبا لیے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس کے بعد میں نے دوسری دیوار کے چار سوئچ دبائے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ بھائی صاحب تیسری دیوار پر کوشش کر رہے تھے اور ناصر چوتھی دیوار کو ٹٹول رہا تھا۔ اچانک میں نے بیک وقت دو بٹن دبا دیے تو ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی اور اُس کے ساتھ ہی دائیں ہاتھ کی دیوار میں ایک دروازہ

نمودار ہو گیا اور گرم گرم ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا۔

ہم تیزی سے اُس دروازے میں گزر کر دُوسری طرف پہنچے تو معلوم ہُوا کہ وُہ بھی ایک کمرہ ہے جس میں تازہ ہوا پتا نہیں کہاں سے آ رہی تھی۔ ہم نے بڑے غور سے چاروں طرف دیکھا تو معلوم ہُوا کہ وہاں ایک روشن دان ہے۔ جس پر بڑی مضبوط سلاخیں لگی ہیں۔ کمرہ آٹھ فٹ اُونچا تھا۔

"ناصر ذرا کندھا دے مجھے۔ دیکھوں تو باہر کیا ہے۔" مَیں نے کہا۔ ناصر ایک دم نیچے بیٹھا اور مَیں نے اُس کے کندھے پر پاؤں رکھ کر روشندان میں سے باہر دیکھا تو مجھے اپنے سامنے کوٹھی کا پچھلا حصّہ نظر آیا۔ ہمارے قریب ہی تھوڑی دُور نوکروں کے کوارٹر تھے۔ ناصر کو بھی مَیں نے اُٹھا کر وُہ منظر دکھایا اور پھر بھائی صاحب سے کہا کہ وُہ بھی دیکھ لیں۔ مگر وُہ بولے کہ زخم کی وجہ سے اُن کے لیے سیدھا کھڑا ہونا مشکل ہے۔ وہ کمرہ کافی روشن تھا۔ مَیں نے وہاں بھائی صاحب کی پنڈلی دیکھی تو معلوم ہُوا کہ گولی اندر نہیں دھنسی بلکہ لگ کر گزر گئی تھی اور زخم گہرا نہیں تھا؛ البتّہ لمبائی میں کافی تشویشناک تھا۔ مگر رومال بندھنے کی وجہ سے زیادہ نہیں بہتا تھا۔ تب مَیں نے اپنی قمیص اُتار کر بنیان نکالی اور اُسے پھاڑ کر لمبی پٹّی بنائی اور بھائی صاحب کے زخم پر کس کر باندھ دی جس سے اُنہیں کافی سکون ہو گیا۔

# باب ۹

"یار پہلے کمرے میں چلے چلو۔ کہیں وہ دیکھ نہ لیں۔ یہ بات راز ہی رہے کہ ہم کمرے کا راز جان چکے ہیں" بھائی صاحب بولے۔

"ہاں ہاں، یہ بات ٹھیک ہے" ناصر بولا۔

"بھئی سیانے آخر سیانے ہی ہوتے ہیں" میں نے کہا اور بھائی صاحب کو سہارا دے کر دُوسرے کمرے میں لے آیا اور پھر ہم نے پہلے کی طرح سوئچ دبا کر دروازہ بند کر لیا۔ اب ہم مُطمئن تھے کہ اگر کسی نے نیچے آنے کی حرکت کی تو ہم دُوسرے کمرے میں بھاگ لیں گے۔ اچانک مجھے ایک بات یاد آئی اور میں نے پُوچھا:

"قبلہ بھائی صاحب وُہ آپ کے ہاتھ میں چاقو کہاں سے آیا تھا؟"

"وُہ مصدر خان کی واسکٹ سے گرا تھا" بھائی صاحب بولے۔ "میں نے تیزی سے اُسے اُٹھا کر کھول لیا اور اُس کی گردن میں دے مارا۔ مر گیا ہوگا سالا!"

"آمین ثم آمین، اللہ کرے وُہ مر گیا ہو۔ خُدا کرے وُہ سب مر گئے ہوں" میں نے کہا۔

"کیوں تمہیں شک ہے کوئی؟ اُس کی گردن سے خُون نہیں بہہ رہا

تھا؟ مَیں نے صاف دیکھا تھا ۔۔۔" بھائی صاحب چمک کر بولے۔

"ارے قبلہ بھائی صاحب سوز کبھی یُوں نہیں مرا کرتے. اُن کے تو دِل میں خنجر اُترے جب مَرتے ہیں وُہ۔ دیکھا نہیں کتنا پلا ہُوا سانڈ ہے. وُہ مصدر خان" مَیں نے کہا۔

اچانک گڑگڑاہٹ پیدا ہُوئی اور اُوپر کی کھڑکی ایک بار پھر کُھل گئی۔ اُنہوں نے حمزہ صاحب کو اناج کی بوری کی طرح دھڑام سے نیچے پھینک کر وُہ لکڑی کی سیڑھی اُوپر کھینچ لی اور پھر دروازہ پہلے کی طرح بند کر دیا۔ حمزہ صاحب بالکل بے ہوش تھے۔ مَیں نے اُن کی نبضیں دیکھیں تو وُہ بہت ہی آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہُوا۔ کیوں کہ وُہ بے چارے ہماری وجہ سے ہی اِس حال کو پہنچے تھے۔

"یار اِنہیں اُس کمرے میں لے چلو' وہاں تازہ ہوا تو ملے گی اِنہیں" مَیں نے کہا۔

"ہاں ہاں' کھولو دروازہ جلدی کرو۔ پتا نہیں کیا ہُوا ہے اِنہیں" ناصر بولا۔ مَیں نے جلدی سے وُہ بٹن دبا کر دروازہ کھولا اور اُنہیں ہم دونوں نے بڑی مشکلوں سے اُٹھا کر دُوسرے کمرے میں پہنچایا۔ اُن کے بدن پر کئی نیلے نیلے نشان نظر آتے تھے۔ اُن کی کنپٹی سُوجی ہُوئی تھی۔ اور رُخسار پر بھی گہری چوٹ لگی تھی۔ نچلا ہونٹ بھی زخمی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُن لوگوں نے مل کر اُنہیں خوب پیٹا ہے اور پھر اچھی طرح

اُن کی ٹھکائی کرنے کے بعد جب دیکھا کہ وُہ بے ہوش ہو گئے ہیں تو اُن بُزدلوں نے اُنہیں تہہ خانے میں پھینک دیا۔ اب اگر اُنھوں نے کوٹھی سے نکل بھاگنے کا منصوبہ بنایا تو پھر ہم تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے نہ ہمیں باہر نکلنے کا راستہ معلوم ہے نہ ہمیں کوئی باہر سے مدد ہی ملنے کی اُمّید ہے۔ میرا تو یہ ساری باتیں سوچ کر دماغ شل ہونے لگا۔ حمزہ صاحب کسی طرح ہوش میں آتے ہی نہ تھے۔ اُنہیں ہوش میں لانے کی ہم ساری تدبیریں آزما چُکے۔ آخر بھائی صاحب کو کچھ یاد آیا اور وُہ بولے :

" یار تُم اِدھر ہٹو، مَیں ایک تدبیر کرتا ہُوں۔" یہ کہہ کر وُہ بڑے اعتماد سے آگے بڑھے اور اُنھوں نے حمزہ صاحب کے مُنہ پر مُنہ رکھ کر بڑے زور سے ہوا اُن کے پیٹ میں داخل کی۔ ایک بار، دو بار، تین بار — اور یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کہ حمزہ صاحب میں اچانک زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ " اِن کے ہاتھوں اور پاؤں کے تلووں پر مالش کرو۔" بھائی صاحب نے حکیم حاذق کی طرح ہمیں حُکم دیا اور ہم فوراً اُن کے حُکم کی تعمیل میں مصروف ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے سانس کا عمل پھر دُہرایا تو اب کی بار حمزہ صاحب نے ذرا دیر کے لیے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں۔ اِسی طرح کرتے کرتے کچھ دیر بعد وہ پُوری طرح ہوش میں آ گئے۔ مگر چوٹوں کی وجہ سے وُہ اتنے نڈھال تھے کہ اُن سے ہاتھ نہیں ہلتا تھا۔

شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے اور ابھی تک حمزہ صاحب کوئی بات کرنے کے قابل نہ ہو سکے تھے اور اب ہمیں گھر کی فکر ستا رہی تھی۔ امّی جان سخت پریشان بیٹھی ہوں گی۔ ہم کبھی اتنے عرصہ تک گھر سے غیر حاضر نہ رہے تھے۔ ابّا بھی سخت فکر مند ہوں گے اور ہمیں خوب بُرا بھلا کہتے ہوں گے۔ گھر میں کتنی اُداسی چھائی ہوگی۔ اس کا مجھے خوب اندازہ تھا۔

حمزہ صاحب ابھی تک کوئی بات کرنے کے قابل نہ ہوئے تھے۔ شام سے ذرا پہلے اُنھوں نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا تو مَیں نے اُن کی قمیص اُوپر چڑھا کر دیکھی۔ تب مجھے معلوم ہُوا کہ اُن لوگوں نے اُن کے بازو میں کوئی ٹیکہ لگا دیا تھا — ارے، مَیں نے کہا۔ بیڑہ غرق ہو اُن لوگوں کا، کہیں یہ زہر کا ٹیکہ تو نہیں لگا دیا انہیں۔

پھر مَیں نے سوچا کہ اگر زہر ہوتا تو حمزہ صاحب بچ نہ سکتے۔ کب کے اللہ کو پیارے ہو چکے ہوتے۔ ہو سکتا ہے اُن لوگوں نے انہیں بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا ہو۔ بھائی صاحب کو مَیں نے بتایا تو وہ بولے:

"ہاں یہی ممکن ہے۔ زہر ہوتا تو کام تمام کر چکا ہوتا۔"

"مگر بھائی صاحب یہ لوگ اب کرنا کیا چاہتے ہیں۔ یُوں ہی بند کر رکھیں گے ہمیں۔"

"اُن کی مرضی ہے میاں، چاہیں تو کبھی بات بھی نہ کریں ہم سے، ناراض ہی رہیں ہمیشہ ہم سے۔" بھائی صاحب بولے۔

"تو پھر فاتحہ پڑھ لیں ابھی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" میں نے کہا۔

"بہتر تو یہی ہے کہ یہ نیک کام پہلے کر لیا جائے۔ ذرا حمزہ صاحب اُٹھ لیں۔ پھر ان سے فاتحہ کی دُعا سیکھیں گے۔" بھائی صاحب خوب چہک رہے تھے۔ حمزہ صاحب کو اپنے ساتھ بندھا دیکھ کر اُن کی بڑی ڈھارس بندھی تھی۔

باہر مکمل اندھیرا چھا گیا۔ شام گئی رات آگئی۔ روشندان میں سے اب ہمیں ستارے صاف نظر آ رہے تھے۔ باہر اُن لوگوں میں سے کسی کسی وقت لان میں کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دیتی تھی۔ ہماری بدقسمتی کا یہ عالم تھا کہ ہم تینوں ہی وہاں پھنس گئے تھے۔ اگر ہم میں سے ایک بھی باہر ہوتا تو گھر میں خبر دیتا کہ ہم پر کیا گزری ہے مگر اب گھر میں کسی کو بھی علم نہ تھا کہ ہم کہاں ہیں اور ہم وہاں تھے جہاں سے ہمیں اپنی خبر نہیں ملتی تھی اور حمزہ صاحب ابھی تک فرش پر چت لیٹے تھے جیسے زندگی بھر کے تھکے ہوئے تھے بے چارے اور اب لیٹ کر آرام فرما رہے ہیں۔

رات کے دس بجے کے قریب اُنہوں نے ہوش سنبھالا۔ تہہ خانے میں گھُپ اندھیرا تھا۔ اُنہوں نے ہمیں ٹٹول کر پہچانا۔ جب اُنہیں تسلی ہو گئی کہ لڑکے ہی ہیں تو بولے:

"صابر بیٹا!"

"جی میں یہاں ہی ہوں۔ کیا حال ہے اب آپ کا؟" میں نے

آگے بڑھ کر پوچھا۔

"ٹھیک ہوں بیٹے، تجھے کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی نہیں حمزہ صاحب، مَیں بالکل ٹھیک ہوں۔ بھائی صاحب کی پنڈلی میں البتّہ گولی لگی تھی۔ اُن کا زخم رِس رہا ہے۔" مَیں نے کہا۔ آفرین ہے بھائی صاحب پر سی تک نہیں کرتے تھے۔ بڑے صبر سے زخم کی تکلیف سہہ رہے تھے۔

"اچھا، زخم گہرا تو نہیں ہے؟" وُہ فکر مند لہجے میں بولے۔

"جی گہرا تو نہیں؛ البتّہ اُنگلی برابر لمبا زخم ہے۔ گولی پار نکل گئی تھی۔" مَیں نے کہا۔

"پھر خیر ہے بیٹے، زندگی ہُوئی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ تازہ ہوا کہاں سے آ رہی ہے؟" وُہ بولے۔

"جی ہم دُوسرے کمرے میں ہیں۔" مَیں نے کہا۔

"اچھا اچھا، اِس کمرے میں ڈالا تھا اُنھوں نے ہمیں؟" وُہ بولے۔

"جی نہیں، ڈالا تو ہال کمرے کے نیچے ہی تھا۔ ہم نے تلاش کر لیا ہے یہ کمرہ۔" مَیں نے کہا۔

"تم نے معلوم کیا تھا اسے؟" وُہ اُٹھ کر بولے۔

"جی ہاں، وہاں بڑے سوئچ لگے تھے۔ وُہ مَیں دبا دبا کر دیکھتا رہا۔ پھر یہ اچانک کھُل گیا۔" مَیں نے کہا۔

"بہت اچھا کیا تُو نے بیٹا، یہ زیادہ ہوادار کمرہ ہے۔ یہاں سے

نکلنے کا راستہ بھی معلوم ہے تمہیں؟" وہ بولے۔

"جی نہیں، مجھے تو معلوم نہیں ہو سکا۔" میں نے کہا۔

"اچھا، گھبراؤ نہیں تم۔ مجھے وہ راستہ معلوم ہے۔ میرے بدن میں اُنہوں نے زہر کا ٹیکہ لگا دیا تھا۔ مگر میں مرا نہیں۔ میں خود ایک زہر کھایا کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ پر اُس کا اثر نہیں ہوا۔" وہ بولے۔

"کون سا زہر کھاتے ہیں آپ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہے ایک زہر بیٹے، وہ میں دوا کے طور پر کھایا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ مجھ پر کسی زہر کا اثر نہیں ہو سکتا۔ سو وہی ہوا۔" وہ بولے۔

"جانتے ہو بیٹا، میں کون ہوں؟"

"جی نہیں، میں تو آپ کے متعلق صرف اِتنا جانتا ہوں کہ آپ کا نام انور حمزہ ہے۔" میں نے کہا۔ اِس پر وہ اپنے قریب کر کے مجھے کہنے لگے:

"بیٹا، تمہیں یہ سُن کر شاید غصّہ آئے کہ میرا نام انور حمزہ نہیں بلکہ ارجن داس ہے اور میں ہندو ہوں۔"

"آپ ہندو ہیں؟ نہیں حمزہ صاحب، آپ مذاق کرتے ہیں۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں بیٹے، میں واقعی ہندو ہوں۔ میرا نام ارجن داس ہے۔ یہ کوٹھی میرے باپ نے بنائی تھی۔ پھر جب مُلک تقسیم ہُوا تو ہم ہندوستان چلے گئے۔ وہاں میرے باپو تو سرگباش ہو گئے اور اُن

کا کاروبار میرے سپرد ہُوا۔ مَیں دیر تک وُہ کاروبار چلاتا رہا مگر کامیاب نہ ہُوا۔ تین لاکھ روپیہ مَیں نے ضائع کر دیا۔ وُہ آدمی جسے ہم چوہان صاحب کہتے ہیں۔ بہت بڑے سمگلر ہیں۔ وُہ بھارت سے پاکستان سمگلنگ کے لیے آیا کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ میرے بھی تعلقات ہو گئے اور ہم دونوں مِل کر یہ کاروبار کرنے لگے۔ اِس عرصہ میں بھٹاکرداس بھی ہمارا ساتھی بن گیا اور ہم زیادہ وسیع پیمانے پر سونے کی سمگلنگ کرنے لگے۔ مگر پھر ستمبر ۶۵ء کی جنگ شروع ہو گئی اور ہمارا سارا مال پاکستان کے دو سمگلروں نے ہضم کر لیا۔ اُن کو ہم بھلا کیا کہہ سکتے تھے وُہ بے ایمان ہو گئے۔ ساڑھے سترہ لاکھ کا مال وُہ دبا بیٹھے اور ہم کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔ دل میں اُن لوگوں کے خلاف سخت غصّہ تھا۔ مگر ہم مجبور تھے۔ پھر یہاں پاکستان میں ہماری مُلاقات قلاچی اور مصدر خان سے ہو گئی۔ یہ لوگ افغانستان سے آئے ہوئے ہیں اور جعلی نوٹ بنانے کے ماہر ہیں۔ مگر انہیں کوئی مناسب ٹھکانہ نہیں ملتا تھا اور یہ کوٹھی مسلمان مالک کے قبضے میں تھی اور مَیں چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح مَیں اِس کوٹھی میں آجاؤں۔ کیونکہ اس کے نیچے جو یہ تہہ خانے ہیں۔ ان سے ہم خوب کام لے سکتے تھے۔ تب مصدر خان نے اِس بڑھیا اور اِس کے بھائی کرتی کو اپنے ساتھ ملایا اور ایک دن میں خفیہ راستے سے اِس تہہ خانے میں آ پہنچا۔ اس مائی کو سوانگ رچانے میں کمال حاصل ہے۔ یہ چڑیل

بن گئی اور کرنل بھوت، اور مَیں نے ان دونوں کے ذریعے سے اس کوٹھی کے مسلمان مالک کی راتوں کی نیند اِس حد تک حرام کر دی کہ آخر وُہ ایک دن یہ سمجھ کر کہ یہ کوٹھی آسیب زدہ ہے اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ بعد میں وُہ امریکہ جا پہنچے۔ کافی دن تک ہم ان تہہ خانوں میں مزے کرتے رہے۔ اِس کے ساتھ والے کمرے میں وہ پریس ہے جس میں ہم جعلی نوٹ چھاپتے تھے۔ وُہ پریس قلابچی نے چلایا تھا۔ پھر میں بھی یہ کام سیکھ گیا اور ان سے کہیں بہتر سیکھ گیا اور پھر ہم سب نے جعلی نوٹ دے کر بازار سے سونا خرید کر بھارت میں سمگل کرنا شروع کر دیا۔ یہ کام ٹھاکر اور چوہان کرتے ہیں— کافی دن تک ہم بڑے آرام سے رہے کہ اچانک ایک دن تم لوگوں نے یہ مکان کرائے پر لے لیا۔ جس سے ہماری آزادی میں سخت خلل پیدا ہُوا اور مَیں نے مائی سے کہا کہ وُہ جس طرح ہو سکے تمہیں یہاں سے نکال دے۔ اُنہوں نے اپنا کام اتنی خوش اسلوبی سے ادا کیا کہ تم جلدی ہی یہ مکان چھوڑ گئے۔ مگر اس عرصہ میں مائی سے یہ حماقت ہُوئی کہ اُس نے کچھ نوٹ روپے کے کہیں راستے میں گرا دیے جو کسی پولیس والے کے ہاتھ آ گئے۔ اس کا نام کاظم تھا۔ اُس نے مائی کو اُس وقت تو کچھ نہ کہا۔ ہم سب کو پکڑنے کا منصوبہ بنایا اور مائی کا پیچھا کرنے لگا۔ ایک دن اُس نے مائی کو باہر اُس میدان میں پکڑ لیا اور پُوچھنے لگا کہ بتا یہ نوٹ کون چھاپتا

ہے۔ مائی اُس کی دھمکیوں سے تنگ آ کر اُسے اِس کوٹھی میں لے آئی اور لا کر اُسے اِس ہال کمرے میں بٹھا دیا اور پھر وُہ نوکروں کے کوارٹروں میں جا کر تہہ خانے میں اُتری اور مجھے اُس نے ساری بات بتائی۔ تب مَیں نے قلاچی سے مشورہ کیا تو اُس نے جا کر اُس کاظم کو اِس تہہ خانے میں گرا کر گلا گھونٹ کر مار دیا اور پھر رات ہی رات میں اُس کی لاش اُٹھا کر اُس نے باہر بدرو میں پھینک دی۔ مگر جلدی میں اس بدبخت نے اُس کی جیب سے ساری چیزیں نہ نکالیں اور جعلی نوٹوں اور اس مائی اور اُس کراچی خان کی باتیں پولیس کے ہتھے چڑھ گئیں۔ کاظم سے یہ غلطی ہُوئی کہ اس نے اپنی کارکردگی پُوری طرح ظاہر کرنے کے لیے کسی اور کو وقت سے پہلے اپنا ہمراز بنانا مناسب نہ سمجھا اور پھر پولیس کے سپاہی ہر مائی کا پیچھا کرنے لگے تم سُن رہے ہو نا؟" وُہ رُک کر بولے۔

"جی ہاں ہم سُن رہے ہیں!" مَیں نے کہا۔

"مگر بیٹے، مجھ سے یہ حماقت ہُوئی کہ مَیں نے تمہیں اپنا دوست بنا لیا۔ بس یہ ایسی حماقت تھی جس کا آج مَیں نے خوب خمیازہ بھگتا ہے۔ میرے ساتھی مجھے اپنے طور پر قتل کر گئے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا بیٹا پرشوتم داس یاد آ جاتا ہے۔ وُہ تمہارے ہی برابر تھا۔ تمہارے جیسی ہی شکل صُورت تھی اُس کی کہ ایک دن وُہ نہر میں نہاتے ہُوئے ڈوب گیا تھا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا بیٹا یاد آ جاتا تھا۔

وُہ تمہاری ہی طرح مُسکرایا کرتا تھا۔ بالکل تمہاری ہی طرح وُہ باتیں کیا کرتا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ اپنی ساری دولت تمہارے حوالے کر دُوں۔ مگر میری یہ بات میرے ساتھیوں کو بالکل پسند نہ تھی۔ جب مَیں نے تمہیں وُہ دو ہزار روپیہ دیا تو قلاچی نے مجھے بہت منع کیا مگر مَیں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر مَیں نے کہا کہ مَیں نے تمہیں جعلی نوٹ دیے ہیں۔ مگر پھر قلاچی کو فکر لگی کہ جعلی نوٹ لے کر جب تم بازار گئے اور کسی نے تمہیں پکڑ لیا تو پھر تُم ضرور ہی ہمارا نام لوگے جس کی وجہ سے ہم صاف پکڑے جائیں گے۔ اپنے اِس خدشے کو مٹانے کے لیے اُس نے بہانے سے تمہارے ہاتھ وہ روپیہ واپس منگوایا۔ مَیں نے اُسے اگلی صُبح بتا بھی دیا تھا کہ مَیں نے صابر کو اصلی نوٹ دیے ہیں مگر اُسے یقین نہیں آتا تھا۔ جب تُم وُہ نوٹ لے آئے تو اُس نے اُن کو دُوسرے کمرے میں جا کر اچھی طرح غور سے دیکھا اور پھر اُسے یقین آیا کہ وہ نوٹ اصلی ہیں۔ جب ہی اُس نے وُہ رقم واپس کر دی تھی؛ ورنہ اُس کا خیال تھا کہ اگر جعلی نوٹ ہُوئے تو وُہ بدل کر تمہیں اصلی نوٹ دے دے گا۔

تمہیں یاد ہے قلاچی اور مَیں انگوٹھیوں سے ٹک ٹک کیا کرتے تھے۔ ہمارے سب ساتھی اِسی طرح کرتے ہیں۔ وہ دراصل ہمارے خفیہ اشارے ہیں۔ وُہ ہمیں شاکر داس نے سکھائے تھے۔ وُہ دراصل کسی زمانے میں تار گھر میں ملازم تھا اور تار کی ٹک ٹک کے کام

سے واقف تھا۔ اُسی اصُول پر اُس نے انگوٹھی کی ٹھک ٹھک کے طریقے بتائے اور ہم سب اِس کام کے ماہر ہو گئے۔ اجنبی لوگوں کے سامنے ہم ہمیشہ ٹھک ٹھک سے ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔

کرملی کو سوانگ بھرنے میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ آج وُہ ڈاڑھی لگا کر آیا تھا۔ اُس کا رنگ در اصل سیاہ ہے۔ مگر آج اُس نے اپنے ہاتھوں، پیروں، مُنہ اور گردن پر ایسا رنگ ملا تھا کہ وُہ گندمی رنگ کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ یہی اُس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ وُہ بھُوت بھی بہُت اچھا بن سکتا ہے۔ وُہ کھوپڑیاں، دانت اور وُہ چوڑے اور الا بلا ساری چیزیں اُسی کی ایجاد کی ہُوئی ہیں اور وُہ اُن کے استعمال سے خُوب واقف ہے۔

اب تو فیصلہ ہی ہو چُکا ہے۔ مَیں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب مَیں ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ دوں گا اور مسلمان ہو کر پاکستان میں رہُوں گا اور تمہارے قریب رہنے کو ترجیح دوں گا کیوں کہ تُم میرے بیٹے کی طرح ہو۔ بالکل پرشوتم داس کی مانند لگتے ہو مجھے۔ اگر میری بیوی زندہ ہوتی تو شاید مَیں بھارت چلا جاتا، مگر بیٹے کے غم میں وُہ بھی مر گئی۔ اب مَیں اِس دُنیا میں بالکل اکیلا ہُوں بیٹے۔ تُم مجھ سے نفرت تو نہیں کرو گے؟ مَیں اتنا بُرا آدمی کبھی نہیں تھا بیٹے، مگر پھر ان لوگوں کے ساتھ دولت کے لالچ میں مَیں نے یہ سب کچھ کیا۔ میرے پاس اِس وقت پاکستان کے ایک بنک میں پینتالیس لاکھ

روپیہ موجود ہے۔ اگر میں قانون کے ہاتھوں بچ گیا تو میں وہ سارا روپیہ کسی رفاہی ادارے کو دے دوں گا یا اس سے کوئی ہسپتال بنوا دونگا۔ کیوں بیٹے، کیا خیال ہے تیرا۔ تو مجھ سے ناراض تو نہیں ہے صابر؟"

"جی نہیں حمزہ صاحب، میں آپ سے بالکل ناراض نہیں ہوں آپ بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔ اگر کاظم کے خون کے چھینٹے آپ کے ہاتھ پر ہوتے تو پھر میں آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔" میں نے کہا۔

"نہیں بیٹے، مجھے اس کے قتل کا علم دوسرے دن ہوا تھا۔ قلاچی نے میرے مشورے کے بغیر ہی اُسے تہہ خانے میں جاکر قتل کر دیا۔ یہ گناہ اُس کی گردن پر ہے۔" حمزہ صاحب بولے۔

"اب کیا ارادے ہیں آپ کے؟" میں نے پُوچھا۔

"دیکھو ایک خفیہ راستے سے میں تمہیں باہر نکال دیتا ہوں۔ تم اپنے ابا کو ساتھ لے کر فوراً پولیس کو اطلاع کر دو۔ وہ رات ہی رات اِس کوٹھی کا محاصرہ کر کے اِن لوگوں کو گرفتار کرلیں گے۔ پھر تم ہمیں بھی ساتھ لے چلو گے۔" وہ بولے۔

"تو چلیں پھر جلدی کریں، ایسا نہ ہو کہ وہ نکل بھاگیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں، اُنہیں یقین ہے کہ حمزہ مر چکا ہے۔ زہر کا ٹیکہ اثر کر چکا ہوگا۔ مگر میں اُن کی توقع کے خلاف ابھی تک زندہ ہوں۔ اُنہیں یہ بھی یقین ہے کہ تم لوگ اِس کمرے سے کبھی نہ نکل سکو گے۔ مگر تم

نے راز معلوم کر لیا ہے۔ چلو میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور پہلے کمرے میں مجھے لے آئے۔ پھر اُنھوں نے سامنے کی دیوار میں ایک جگہ ماچس جلا کر اُنگلی سے دیوار کو دبایا تو وہاں ایک دروازہ نمودار ہُوا۔

"بولے اِس میں داخل ہو جاؤ۔" مَیں آگے بڑھا تو میرے پیچھے وہ بھی آ گئے۔ سامنے ایک تنگ سی سُرنگ تھی جس میں ہم بیٹھ کر چل سکتے تھے۔ کچھ دُور چلنے کے بعد رکاوٹ آ گئی۔ وہاں اُنھوں نے ماچس جلائی اور ایک ڈھکنا سر کے اُوپر ہاتھ بڑھا کر کھول دیا بولے:

"داخل ہو کر نکل جاؤ۔" جُوں ہی مَیں نے اُٹھ کر اُس سُوراخ میں سے سر اُوپر نکالا۔ مجھے اپنے سامنے ہموار زمین دکھائی دی۔ مَیں کوٹھی سے باہر دیوار کے قریب کھڑا تھا۔ وہ دروازہ حمزہ صاحب نے بند کر دیا تو معلوم ہُوا کہ وہاں کوئی نشان ہی نہ تھا۔ اُس ڈھکنے پر گھاس پھُونس اُگی ہُوئی تھی۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔

مَیں وہاں سے تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا گھر پہنچا تو ابّا جان اور امّی صحن میں بیٹھے تھے۔ فکر کی وجہ سے اُن کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ مجھے زندہ سلامت دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی۔ مَیں نے اُنھیں جلدی جلدی ساری بات بتائی تو امّی جان تو ایک دم اُن غنڈوں کو گالیوں پر گالیاں دینے لگیں۔ وہ تو اِس کارِ خیر میں مصروف ہو گئیں اور ہم

دونوں باپ بیٹا تیزی سے کوتوالی کی طرف بھاگ نکلے۔ وہاں جاکر میں نے تھانیدار کو ساری باتیں الف سے یے تک بتادیں تو وہ فوراً مسلح گارد لے کر ہمارے ساتھ چل دیے اور جاتے ہی اُنھوں نے چاروں طرف سے کوٹھی کو گھیرے میں لے لیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ کی دوڑ دھوپ کے بعد مائی اور کرملی کے علاوہ تمام آدمی اُن کی حراست میں آچکے تھے۔ حمزہ صاحب نے یُوں کیا کہ اپنی طرف سے تہہ خانے کے تمام راستے کچھ اِس طرح بند کر لیے کہ کوئی بھی مجرم وہاں داخل ہو کر بھاگنے کی راہ نہ پا سکا۔ جب ہر طرف سے ہم مطمئن ہو گئے اور ہمیں یقین ہو گیا کہ چوہان، ٹھاکر، معصدر خان اور قلاچی صاحبان گرفتار ہو چکے ہوں گے تو حمزہ صاحب نے کوئی پَون گھنٹے کے بعد بڑے اطمینان سے وُہ خفیہ دروازہ جو چھت میں کھلتا تھا اندر سے کھول دیا۔ وہاں ایک سوئچ تھا جو عین چھت کے قریب دیوار میں لگا تھا۔ اُس کا ہمیں کسی طرح بھی علم نہ ہو سکتا تھا۔ حمزہ صاحب ناصر کے کندھے پر کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے وہ سوئچ دبا دیا۔ وُہ کھڑکی سی آپ ہی منوّر ہو گئی اور اُس کے ساتھ ہی ایک سپاہی تہہ خانے میں گر گیا۔ میں، تھانیدار اُس کے چار سپاہی اور حمزہ صاحب کے تمام ساتھی اِس وقت ہال میں موجود تھے۔ جُوں ہی وُہ سپاہی کھڑکی میں سے دھڑام سے نیچے گرا کمرے میں کھلبلی مچ گئی۔ قلاچی اور اُس کے ساتھی تو بندھے ہوئے تھے ہتھکڑیوں میں۔ تھانیدار نے ایک دَم پستول تان لیا۔

اور بولے :

" کون ہے ؟ خبردار ، جو کسی نے حرکت کی تو گولی مار دوں گا "

" یہ مَیں ہُوں جناب ، میرے ساتھ صابر کے بھائی ہیں ، ہمیں اُوپر کھینچیں " حمزہ صاحب نے کہا ۔

اِس پر ہال کمرے میں رکھی ہُوئی سیڑھی نیچے اُتاری گئی اور وہ تینوں اُوپر چڑھ آئے ۔ مشکل یہ آپڑی تھی کہ جس راستے سے مَیں باہر نکلا تھا وہ راستہ مجھے پھر نہ مل سکا ۔

تھانیدار نے حمزہ صاحب کو بھی ہتھکڑی لگا لی ۔ ابھی وُہ اُن کا نام کاغذوں پر درج کرنے کو ہی تھے کہ ابا جان سے کہہ کر مَیں نے تھانیدار کو سمجھایا کہ حمزہ صاحب کو چھوڑ دیں ۔ اُنہوں نے تو ہماری جان بچائی ہے ۔ مگر تھانیدار نے حمزہ صاحب کے خلاف چالان بھر دیا ۔ وُہ کسی کی بھی سُننے کو تیار نہ تھے ۔

اس کے بعد اُس کوٹھی کے تمام کمروں ، الماریوں ، نوکروں کے کوارٹروں اور سارے تہہ خانوں کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے مختلف الماریوں میں بند کئی لاکھ کے جعلی نوٹ ملے ۔ تہہ خانے میں چار کمرے تھے ۔ چوتھے کمرے میں پریس لگا ہُوا تھا اور وہاں سے نفیس قسم کا کتنا ہی کاغذ برآمد ہُوا ۔ تیسرے کمرے میں سے اٹھاون لاکھ روپے کا سونا ملا جسے وہ عنقریب دُوسرے ملکوں میں بھیج دینے کا منصوبہ بنا رہے تھے ۔ بھارت کے کئی باشندوں کے نام مُہر بمُہر چٹھیاں ملیں ۔ معلوم یہ

ہُوا کہ وُہ سمگلروں کی کوئی بین الاقوامی تنظیم کے رُکن لوگ تھے جو اُس رات ریاض منزل میں پکڑے گئے۔

حمزہ صاحب لاکھ کہتے رہے کہ مَیں سلطانی گواہ بنتا ہُوں۔ مجھے چھوڑ دیا جائے۔ مَیں نے اِن بچّوں کی جان بچائی ہے! ورنہ قلاچی اور مصدر خان انہیں جان سے مار دیتے۔ مگر تھانیدار نے سارے معاملات عدالت کے سامنے رکھ دینے کا فیصلہ کیا اور کہا کہ ابھی میں کچھ نہیں کر سکتا۔

قلاچی، مصدر خان، ٹھاکر، چوہان، کرتلی اور اُس بڑھیا کو جب عدالت میں پیش کیا گیا تو وُہ سب کے سب اپنے پہلے بیانات سے منحرف ہو گئے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم بے گناہ ہیں۔ ہمیں خواہ مخواہ اِس جھوٹے مقدمے میں پھنسایا جا رہا ہے۔ ہمیں نہیں پتا کہ وُہ پریس کِس نے لگا رکھا ہے اور ہمیں نہیں معلوم کہ کاظم کو کِس نے قتل کیا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ انور حمزہ کون ہے۔ اُسے ہم نے پہلی بار اُس روز دیکھا ہے۔ وُہی اُن بھُوتوں کا کاروبار چلاتا ہو گا۔ اُسی نے جعلی نوٹ چھاپے ہوں گے۔

چوہان صاحب کہنے لگے کہ میں تو شریف آدمی ہُوں۔ مَیں نے تین سو روپے ماہوار کرایے پر وُہ کوٹھی شرفو چوکیدار کی معرفت حاصل کی تھی۔ اِس پر شرفو چوکیدار کو بُلایا گیا تو اُس نے کہا کہ چوہان صاحب ہی نے کوٹھی کرایے پر لی تھی۔

اب تو معاملہ بہت ہی پیچیدہ ہو چکا تھا۔ کاغذات اور ملزم ایک بار پھر عدالت نے پولیس والوں کو دے دیے۔ تھانیدار صاحب نے اب کی بار حمزہ صاحب کو سلطانی گواہ بنانے میں ہی مصلحت سمجھی۔ ابتدا میں اُن کا خیال تھا کہ حمزہ سمیت سب آدمیوں کو سزا ملنی چاہیے کیوں کہ وُہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ مگر جب حمزہ صاحب سلطانی گواہ بنے اور اُنھوں نے اپنے ساتھیوں کے تمام کرتوت ثبوت کے ساتھ عدالت میں کھول دینے کا وعدہ کیا تو ایک بار پھر معاملہ عدالت کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

ملزم عدالت میں پیش ہوئے تو حمزہ صاحب نے وہ تمام باتیں عدالت کے سامنے دُہرا دیں جو وہ ہمیں تہہ خانے میں بتا چکے تھے۔ وُہ ایسی باتیں تھیں کہ اُن کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی اُن کو رُد نہ کر سکتا تھا۔

کافی دن تک مقدمہ چلتا رہا۔ آخر فیصلہ کا دن قریب آپہنچا۔ اخباروں میں اُس مقدمے کی بڑی دُھوم تھی۔ وُہ جمعرات کا دن تھا۔ عدالت میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ایک دُنیا اُس مقدمے کا فیصلہ سُننے کے لیے وہاں پہنچی ہُوئی تھی۔

عدالت میں تمام مجرموں کے خلاف اتنی ٹھوس شہادتیں حمزہ صاحب نے اکٹھی کر دیں کہ اُن کے لیے انکار کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہی اور وُہ سر جُھکا کر خاموش ہو گئے۔

عدالت نے قلاچی کو کاظم کے قتل کے جرم میں پھانسی چڑھا دینے کا حکم دیا۔ مصدر خان، چوہان، ٹھاکر، کرتی اور اُس بڑھیا کو جس کا نام پھاتاں تھا چودہ چودہ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ بنکوں میں پڑا ہوا اُن کے نام کا تمام روپیہ حکومت نے ضبط کر لیا۔

ہماری جان بچانے اور عین وقت پر مجرموں کی نشاندہی کر کے انہیں گرفتار کروانے کے صلے میں حمزہ صاحب کے تمام گناہ معاف کر دیے گئے۔ بنک میں اُن کا جو روپیہ جمع تھا اُن میں سے صرف پانچ لاکھ روپیہ اُن کے پاس گزارے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

ہمیں یعنی مجھے، شاکر بھائی اور ناصر کو کراچی کے سیٹھ نے ساٹھ ہزار روپیہ انعام دیا۔ کیوں کہ اُس کی پوری رقم اُسے پولیس نے واپس دلا دی تھی اور بھی بہت سے لوگ جو قلاچی اینڈ کمپنی کا شکار ہوئے تھے۔ اپنی اپنی رقمیں واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔

حمزہ صاحب جب عدالت سے بری ہو کر گھر آئے تو آتے ہی ہمارے محلے کی جامع مسجد کے مولوی صاحب کے سامنے جا کر مسلمان ہو گئے۔ جب ہم سب اُن کو کلمہ پڑھا کر واپس لائے تو وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

راستے میں مَیں نے بھائی شاکر سے کہا:

"میرے قبلہ و کعبہ جناب بھائی محمد شاکر صاحب"۔

"فرمائیے جناب قبلہ و کعبہ بھائی محمد صابر صاحب کیا حکم ہے؟"

بھائی صاحب پہلی بار میرے اِس القاب پر خوش ہو کر بولے۔

"بات یہ ہے کہ میرے خیال میں سال چھ ماہ کی سزا تو آپ کو بھی ملنی چاہیے تھی"۔

"وہ کس خوشی میں جناب، اگر منہ اچھا نہ ہو تو آدمی بات تو اچھی کرے"۔ وہ چمک کر بولے۔

"آپ نے جو صدر خان کی گردن میں چاقو مارا تھا وہ کس حساب میں گیا"۔

"ارے وہ تو اسی کا چاقو تھا جسے میں نے چھین کر اُس کی گردن میں مار دیا۔ پھر میں نے بھی تو پنڈلی پر گولی کھائی ہے۔ یاد ہے جناب کو۔ ہفتہ بھر تکلیف برداشت کرتا رہا ہوں میں۔ بھائی صاحب بولے۔

"ہاں سزا تو آپ کو کافی مل چکی ہے۔ اچھا اب آپ ناصر کو پچیس ہزار روپیہ دلوا دیں۔ کیوں کہ ہمیں ساٹھ ہزار روپیہ کراچی سے ملا ہے دس ہزار روپیہ لاہور کے صراف سے اور تین ہزار روپیہ حکومت کی طرف سے ہمیں غیر معمولی جرأت اور بہادری دکھانے کے صلے میں ملا ہے۔ دو ہزار روپیہ میرے پاس حمزہ صاحب کا دیا ہوا موجود ہے اور اِس تمام رقم میں سے ناصر تیسرے حصے کا حقدار ہے"۔ مَیں نے انہیں راستے میں رُک کر ساری بات سمجھائی۔

"ہاں ہاں، تو مَیں نے کب انکار کیا ہے۔ اگرچہ سارا کام تو مَیں

نے ہی کیا ہے۔ پر چلو تم دونوں بھی ایک ایک حصّہ الگ کر لو" بھائی صاحب بولے۔

"ہاں ہاں، بڑے بہادر ہیں آپ۔ جب وہ تہہ خانے میں اُتار رہے تھے تو آپ کو تو یاد ہے آپ رونے ہی لگے تھے۔" میں نے کہا۔

"وہ موقع ہی ایسا تھا بھئی۔ چلو اب پچھلی باتوں کو بھول کر اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ وہ لوگ خود ہی اپنے انجام کو پہنچے ہیں۔ بُرائی کبھی نہیں پنپ سکتی۔" حمزہ صاحب نے کہا۔

"اب آپ ہمارے پاس ہی رہا کریں گے نا؟" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں بھئی، ہم اب ہمیشہ اپنے بیٹے کے پاس رہیں گے۔ کہیں نہیں جائیں گے۔ اب کبھی ٹھگ ٹھگ نہ کریں گے نہ کبھی بے ایمانی کی بات سوچیں گے۔" حمزہ صاحب نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا اور ہم ہنستے ہوئے گھر کی طرف چل دیے۔

حمزہ صاحب واقعی مسلمان ہو چکے تھے۔